آخری سلام
شکیل اختر

آخری سلام

(افسانے)

شکیلہ اختر

—— : تقسیم کار : ——

نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکاڈمی
کا مالی تعاون شامل ہے

•

اشاعت اول ۱۹۸۶ء

کتابت .. .. علی احمد

طباعت .. .. نامی پریس لکھنؤ

تعداد .. .. ایک ہزار

ناشر .. .. مصنف

:- قیمت :-

۳۰ روپے

:- ملنے کا پتہ :-

نصرت پبلشرز- امین آباد- لکھنؤ
226018

فہرست

آہ کی صدا نکلی

بینڈ باجے کی پر سرور آوازوں، آتش بازی کے خوبصورت آتشیں رنگین و نازک پھولوں کے آبشاروں، دلکش اور کیف آگیں ہنگاموں سے گذرتے اور نئی زندگی کے ستاروں بھرے راستوں پر سے ہو کر جب وہ گیتوں کے مدھر بھروں میں سجے سجائے کمرہ میں پہنچایا گیا تو اس حجلۂ عروسی میں ساری رنگینیوں کے قوسِ قزح سمائے ہوئے تھے۔ دلہن کی سیج پھولوں سے سجی خوشبوؤں سے معطر ہو رہی تھی، چھپر کھٹ پھولوں کی لڑیوں سے سجی نگاہوں میں نشہ گھول رہی تھی اور انہی پھولوں کے لہراتے ہوئے پردے کے پیچھے دلہن اپنے گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ فیصل نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور اس نے کمرے کو روشن سے روشن تر بنانے کے لیے ساری لائٹیں یکبارگی جلادیں۔ دلہن کے قریب آکر بڑی بیتابی سے اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ جھلملاتے ہوئے زرتار گھونگھٹ کے اٹھتے ہی دلہن کا خوبصورت جھکا ہوا چہرہ فیصل کی نگاہوں میں پر مسرت بیقراریوں کو اور بھی بڑھا چکا تھا وہ دلہن کے اور قریب سرک آیا۔ اپنے ہاتھ سے دلہن کا شرمایا لجایا جھکا ہوا چہرہ تھوڑا اوپر اٹھایا فیصل کی انگلیوں کے لمس سے شرمیلی دلہن کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ خوبصورت آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ فیصل نے بڑے پیار سے دلہن کو دیکھا مگر اچانک ہی اس کی نگاہیں کانپ اٹھیں ـــــ یہ .... یہ چہرہ ..... یہ آنکھیں ـ یہ

لب و رخسار...... یہ اس کے اپنے تو نہیں تھے ...... یہ اس کی اپنی شیما تو نہیں تھی۔ پھر! — پھر ان دونوں کے درمیان یہ تیسری ہستی کہاں سے آ گئی — ؟ شیما! جو اس کی تمناؤں کی انتہا تھی وہ اُسے کہاں چھوڑ آیا تھا — ؟ وہ جو — پھولوں سے بھی نازک اور خوشبوؤں سے بھی زیادہ معطر تھی جس کی معصوم نگاہوں نے چاند کی کرنوں اور دن کے اُجالوں میں بار بار اپنی پاکیزہ محبت کا بے خبری میں ٹوٹ ٹوٹ کر اظہار کیا تھا، جس لڑکی نے چپکے ہی چپکے اس کے قدموں کی دھول کو اپنی مانگ کی افشاں بنا لیا تھا — وہ اچانک کہاں گم ہو گئی تھی...... ! فیصل کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر پکارے شیما! تم کہاں ہو؟ مگر اس کے گلے میں پڑے ہوئے چمکیلے ہاروں اور پھولوں کے گجروں کے بوجھ نے جیسے اس کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔

فیصل اپنے آپ سے اتنا کھو چکا تھا کہ وہ اس کمرے کے حسین ماحول اور اس کے گرد و پیش سے بھی بے خبر ہو کر رہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بچپن کے گھروندے میں اس کے ساتھ ایک ننھی سی بچی یاد آنے لگی جو ڈگمگ ڈگمگ قدموں سے چلتی ہوئی مٹھی بھر بھر کے دھول اور مٹی فیصل کی گود میں ڈالتی جاتی تھی۔ پھر وہ اور ننھی بچی سارے کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے سے کھیلنے لگے تھے۔ بچپن کا اولین نقش کتنا گہرا ہوتا ہے۔ فیصل نے جب یہ بات شیما کو بتائی تو اس کی آنکھیں یکبارگی آنسوؤں سے چمک اُٹھی تھیں۔ "احمق لڑکی — ! جب نہ تب آنسوؤں کی لڑیاں لٹانے لگتی ہے۔" فیصل نے کئی بار اس کو سمجھایا تھا۔ کبھی کبھی فیصل سے وہ بڑے بھولے پن کے ساتھ گہری گہری باتیں کہہ جاتی تھی۔ گھر کے دوسرے لڑکے اور لڑکیاں اس کے دوپٹے سے ڈھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے یہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ "اتنی باتیں اس نے کہاں سے سیکھ لی تھیں ؟۔

شیما ایک ایسی منہ بند کلی کی طرح تھی جو اپنے جذبوں، کیفیتوں، اپنے

حسن اور اپنی تمناؤں میں سمٹی ہوئی رہتی، جس کو سمجھنا آسان نہ تھا، وہ شبنم کے پاکیزہ قطروں کی طرح مقدس تھی؛ اس کی آنکھوں میں معصومیت کا حسن اور چہرے پر فرشتوں جیسا نکھار۔ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس سادہ سی لڑکی کا دل بھی کسی کے نام پر تیز تیز دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ جو خیالوں اور تصورات کی دنیا میں بسنے والی تھی اس کو اپنی موسیقی کے غمگین سروں سے محبت تھی اور جو رات کی تنہائیوں میں بہت دیر دیر تک اپنے مضراب کے تاروں کو چھیڑ کر اپنا حالِ دل کائنات کے دھڑکتے ہوئے دل میں جذب کرنے کی سعی کرتی۔ تب اس وقت اس کی پلکیں بھیگ جاتیں، کمرے سے باہر ٹپکتے ہوئے شبنم کے قطرے اُس کی روح کو ایک ٹھیس سی لگاتے اور پل بھر کے لیے ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی۔ اپنی محرومیوں کا یہ کھلا ہوا اظہار۔ ؟ یہ ٹپ۔ ٹپ گرتے ہوئے شبنم کے قطرے کائنات کی پھیلی ہوئی وسعتوں میں کیا اپنے آپ کو کہیں چھپا نہیں سکتے تھے؟

فیصل کی نگاہوں کے سامنے وہ کھیلتے کودتے بڑی ہوئی تھی۔ اپنے اسکول کی ساری باتیں وہ اُسی کو سنایا کرتی۔ اسکول کا سارا ہوم ورک وہ جلدی جلدی ختم کر کے فیصل کو دکھاتی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باہر نکل جاتے۔ شیما ایک ننھی سی چڑیا کی طرح چہچہاتی پھرتی اور فیصل اپنی چھوٹی سی عمر میں اپنے اندر بڑے پن کا احساس لیے شیما کے ساتھ باغوں، پارکوں میں گھومتا پھرتا۔ صبح کے اُجالے، شام کا سنہرا پن اور راتوں کے اندھیروں میں چمکتے چاند ستارے اور جگنوؤں کی طرح جھلملاتی بجلی کی روشنیاں ان کے معصوم دلوں کو مسرت و انبساط سے بھر دیا کرتے تھے۔ دن، مہینے اور سال گذرتے چلے گئے۔ ننھے بچوں کی کتابیں بدلتی چلی گئیں، اوپر جاتے ہوئے نچلے زینے اُن کے پیروں کے نیچے سے آپ ہی آپ کھسکتے چلے گئے۔ اب اُن کی نگاہوں

میں انتظار گھلنے لگا تھا۔ انتظار کی یہ خلش دلوں کو پر اضطراب سرور بخشنے لگی تھی۔ اور دلوں کی دھڑکنوں میں جیسے تمناؤں کی رنگینیاں چاہے بغیر اچانک بھرنے لگ گئی تھیں۔ شاید اسی طرح ہواؤں میں بھی کوئی نشہ بھر گیا تھا جو آنکھیں کھولنے پر بھی پلکیں خود بخود جھکی چلی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں موسموں کو کیا ہو گیا تھا جو ان کے سرد گرم جھونکے رگ و پے میں ایک سرور سا بھرتے چلے جاتے تھے۔ چہروں پر ادھ کھلی گلاب کی کلیوں جیسا رنگ و حجاب اور آنکھوں میں حیا کا خمار۔۔ یہی تو حسن کی انتہا تھی، یہی پاکیزگی، یہی اچھوتا پن، سادگی اور شرم و حیا کا یہی نشہ کسی کسی کے دل میں محبت کا چراغ جلا کر اجالا بکھیر دیتا۔ شیما مہینوں اپنے آپ سے الجھتی رہی، دیکھنے اور دیکھے جانے والی خواہ مخواہ کی یہ آرزو اس کے دل میں اس طرح سے کیوں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی چلی جا رہی تھیں۔۔؟ وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی، نگاہوں کے پردوں میں چھپی ہوئی دل کے نہاں خانے میں کعبۂ محبت کے جلتے ہوئے ایک مقدس چراغ کو زمانے کی پر تجسس نگاہیں ذرا کی ذرا میں کیسے پہچان لیتی ہیں۔؟ وہ تو آنکھیں اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتی رہی تھی۔ مگر شاید چہرے پر انار کلیوں کی چھلکتی ہوئی رنگت کسی معصوم محبت کی پردہ پوشی نہ کر سکتی تھی سرگوشیوں نے سر اٹھایا۔ نگاہوں میں چبھتی ہوئی مسکراہٹوں کی بجلیاں سی بھرنے لگیں اشاروں کی گفتگو میں خنجروں کی سی کاٹ آتی چلی گئی۔ لوگوں کو دیکھ کر شیما حیران تھی۔ یہ وقت اور لمحوں میں اچانک کیسا تغیر آ گیا تھا جو اس کی راہوں میں خواہ مخواہ کانٹے بچھتے چلے جا رہے تھے آخر تھک ہار کر اس نے اپنے آپ کو بدل دیا۔ کالج میں وہ پہلے جیسی ہنسی، بولتی زندہ دل لڑکی تھی جو ڈیبیٹ میں خوب حصہ لیتی، کالج کے ہر فنکشن میں آگے آگے رہتی لیکن گھر کے گیٹ سے اندر آتے ہی اس کی شخصیت بدل جاتی تھی جیسے وہ شیما نہیں کوئی دوسری لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زمانے سے

ٹکر لینے کی اس میں ہمت نہیں ہے" وہ اپنے گھر کے احاطے میں بیٹھ کر بھی فیصل کے گھر کی طرف دیکھنے سے نظریں چرائے رہتی ۔۔ مگر فیصل ذرا بھی نہ بدلا تھا اس کے وہی انداز تھے، وہی سادگی اور معصوم محبت بھرے لہجے، شیما کبھی کبھی اکیلے میں اُسے سمجھاتی ۔" فیصل اپنے انداز بدلو۔ آنٹی کی بدلی بدلی سی نگاہیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں " مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، کبھی جھلا کر کہہ اٹھتا۔

" جاؤ۔ جاؤ گڑیا کھیلو ۔۔ تم جیسی بے وقوف لڑکیاں پڑھ لکھ کر بھی جاہل کی جاہل رہتی ہیں ۔ ہونہہ! ہر کسی سے خوفزدہ رہنے کا تم لوگوں نے فیشن بنا لیا ہے ۔ بس مجھے کچھ نہیں سوچنا ہے سمجھیں"؟ ۔ وہ اس کی جھکی جھکی آنکھوں میں جھانک کر اسی طرح تسلیاں دیا کرتا تھا۔

فیصل کے خاندان سے اس گھر کے بڑے قریبی تعلقات تھے، ہر کسی کو یہی معلوم تھا کہ یہ بہت قریبی رشتہ دار ہیں ۔ دونوں کی کوٹھیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں ۔ درمیان میں بس تھوڑی سی اونچی باؤنڈری وال تھی ۔ فیصل کے انجینئر ہونے میں چند ہی مہینے رہ گئے تھے اور شیما ام اے کے آخری سال میں تھی ۔

فیصل وقت کی زنجیروں کی آواز کو محسوس کر رہا تھا لیکن اس کو کسی کی پرواہ نہ تھی، حالات و زمانے کو اس نے اپنے آگے کبھی اہمیت نہیں دی تھی، اگرچہ اب تک کسی طوفان سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا، لیکن اس کا خیال تھا کہ انسان اپنے جذبوں سے ہواؤں کا رُخ بدل سکتا ہے ۔ گھر کی فضا میں جیسے جیسے تناؤ اور اداسی کو چھاتے ہوئے وہ دیکھ رہا تھا اس کے قہقہے اور بھی گونجنے لگے تھے، وہ گھر بھر کا چہیتا تھا اور خاص کر اپنی ماں کی آنکھوں کا تارا تھا ۔ فیصل کبھی کبھی

سوچنے لگتا تھا کہ ماں کی محبت میں بھی کتنی خود غرضیاں آجاتی ہیں۔ ممتا جو دنیا کی سب سے بڑی چاہت ہے وہ بھی اس داغ سے خالی نہیں ہوتی۔ اور یہی ایسی بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ خاندانی دوستی، برسوں کی رفاقت، عزت و امارت بالکل ایک جیسی پھر بھی اس کی ممی کی یہ ضد تھی کہ "فیصل تم میری برسوں کی تمنا پوری کر دو۔" اس نے بہت مشکلوں سے اپنے آپ کو نارمل رکھا تھا بالکل پہلے جیسا ہنسنے ہنسانے والا فیصل۔ وہ جانتا تھا کہ ممی نے اپنی چہیتی بھانجی کو اپنے گھر صرف اُسی کو پسند کرانے کے لیے بلا رکھا ہے مگر وہ گھر کے سارے لوگوں کی طرح نیلو سے بھی ملتا اس سے باتیں کرتا اس طرح اس نے کسی پر یہ ظاہر ہونے ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کھیلے جانے والے ڈرامہ کے اصل کردار سے خائف ہے۔ نیلو ایک اچھی لڑکی تھی، خوبصورت سی شوخ اپنے آپ کو لیے دیے رہنے والی اور دور دور تک نگاہیں رکھنے والی، جو کس سی وہ خود تھی یا اس کو ایسا بنایا گیا تھا، فیصل کی سمجھ میں وہ اب تک نہ آسکی تھی۔ شیما کے گھر میں کوئی الجھن نہ تھی، بس سب کچھ معمول کے سے حالات تھے مگر شیما چوکنا ہو چکی تھی۔ اس نے آنے والے خطرے کی بو کو محسوس کر لیا تھا، ویسے بھی دل کا چور بات بات پر ڈرتا ہی رہتا ہے، ایک دن فیصل کی ممی نے بڑے لاڈ اور پیار کے ساتھ نیلو کو شیما کے گھر لے جا کر سب سے ملایا اور ساتھ ہی شیما کی امی کو آہستہ سے یہ بات بھی بتا دی کہ "نیلو فیصل کے لیے بچپن کی مانگ ہے۔" شیما کی امی کے چہرے پر ہلکا سا ایک رنگ آیا لیکن جلد ہی ان کی شرافت کا خون ان کے چہرے پر ظاہرا خوشیوں کا روپ بھر گیا۔

شیما نیلو سے بڑے خلوص سے ملی مگر نیلو اُس کے ہر انداز کا بڑی محویت سے جائزہ لیتی رہی تھی، جیسے وہ ایک ہی جست میں اس کی آنکھوں

کی گہرائیوں میں ڈوب کر شیما کے دل کے اندر سے فیصل کی محبت کے صدف کو توڑ کر کوئی انمول موتی نکال لینا چاہتی ہو۔ نیلو کبھی کبھی ایک بڑھی لکھی احمق سی نظر آنے لگتی تھی ۔۔ اب آنے والا وقت کون سی کہانی سنائے گا یہ تو بچاری شیما بھی نہ جانتی تھی۔

نیلو اور شیما کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ نیلو سجی سجائی چکنی سی گڑیا جیسی رہتی جس کو نظر بھر کر دیکھنے سے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے، اور شیما دھیرے دھیرے مسکرانے والی سادہ سی خوبصورت، اور گہری سیاہ بڑی بڑی نشہ برساتی آنکھوں والی پُر سکون لڑکی تھی، جس کو دیکھتے ہی پھولوں سے ڈھکا ہوا وہ معطر کنج یاد آنے لگتا تھا جہاں جاتے ہی نیند کا خمار چھا جاتا ہو۔

رات کا ہلکا اندھیرا ابھر چکا تھا کہ اچانک فیصل تیزی سے چلتا ہوا آیا۔ "شیما ۔ شیما! ارے بھئی جلدی کرو ۔ ہمارے گھر میں ایک تماشہ ہو رہا ہے۔ آؤ! ۔ آؤ۔ تم بھی دیکھ لو۔" اور وہ اسی طرح دوڑتا ہوا شیما کی امی کے پاس پہونچ گیا۔ آنٹی آپ بھی چلئے نا ۔ ہمارے یہاں کٹھ پتلی کا ناچ ہو رہا ہے بڑا مزا آئے گا۔ چلئے آنٹی! آپ تو ایسے کھیل کم دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"ارے بیٹے! میں نے کٹھ پتلی کے ناچ بہت دیکھے ہیں۔ اب تم لوگ دیکھو۔"

"تو پھر ۔ میں شیما کو لیے جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

فیصل جب شیما کا ہاتھ تھامے اپنے گھر میں داخل ہوا تو ایک ہی

ساتھ اس کی ممی اور نیلو کی آنکھیں دھم سی پڑ گئیں۔ کٹھ پتلی والے نے ناچ شروع کر دیا اور لہک لہک کر گا رہا تھا "ناچو رے کٹھ پتلی گڑیا۔ پیا سنگ ناچو" وہ گا رہا تھا اور پردے کے پیچھے بڑی مہارت سے اس کی انگلیاں ڈوریوں کو تیزی سے حرکت دیتی جا رہی تھیں، کٹھ پتلی گڑیائیں ٹھمک ٹھمک کر، لہک لہک کر، تھرک تھرک کر، اپنے نازو نخروں کے ساتھ ناچتی رہیں ــــ اور ناچتی چلی گئیں ــــ فیصل بڑی حیرت سے گھر کے بچوں کی طرح حیران نگاہوں سے کٹھ پتلی کا ناچ دیکھتا رہا تھا ــــ تماشا جب ختم ہو گیا اور فیصل کی ممی تماشے والے کو پیسے دینے کے لیے اُٹھ کر اندر گئیں تو اچانک فیصل کے قہقہے گونج اٹھے "یہ بچاری کٹھ پتلی گڑیا جب چاہو جس گھر میں نچا دو۔ ہاں مگر نچائی جانے والی انگلیوں میں ایسی صفائی کہاں ہوتی ہے، ڈوریاں تو صاف جھلکتی نظر آجاتی ہیں" نیلو کا چہرہ بجلی کی روشنی میں غصے سے بھرا ہوا دکھ رہا تھا۔ وہ تو بڑا اچھا ہوا جو فیصل کی ممی وہاں سے جا چکی تھیں۔ شیما عجیب مصیبت میں پھنسی گئی تھی ــــ" توبہ! یہ فیصل تو کسی دن اپنے ساتھ اس کو بھی لے ڈوبے گا"! پھر رفتہ رفتہ فیصل بجھتا چلا گیا ــــ! شیما حالات سے یکسر ناواقف تھی کبھی کبھی فیصل کا اداس چہرہ دیکھ کر اس کو خیال ضرور آجاتا تھا کہ اس کے خلاف کچھ ہو رہا ہے۔ آنے والے حادثات کا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ اب دو گھروں کی قربتیں بہت دور خلا کے اس پار نظر آنے لگی تھیں۔ فضاؤں پر ایک جمود سا طاری ہو کر رہ گیا۔ فیصل چپ چاپ سا رہنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں ویران ہو چکی تھیں، اس کی ہنسنے ہنسانے والی باتوں کی جگہ چڑچڑاہٹ سی بھر گئی تھی وہ ایک ہمساتھ جیسے سارے زمانے سے روٹھا روٹھا سا لگتا تھا۔ شیما اپنی گھبراہٹوں

اور پریشانیوں کو ایک غمگین مسکراہٹ میں چھپائے ہوئے تھی، وہ فیصل کے غموں کو اور زیادہ گہرا اور شدید بنانا نہیں چاہتی تھی، مگر فیصل کی نگاہوں میں حرف شکوہ ہی نہیں درد و الم کی ایک پکار بھی تھی، وہ شیما کی خاموشی سے ناراض تھا اس کا دل چاہتا تھا کہ اس انگارے بھری زمین پر وہ فیصل کے ساتھ قدم ملا کر چلے۔ شائد وہ اکیلا حالات سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا۔!

لیکن میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہو فاصی؟" شیما نے اس کی پریشاں حالی کو دیکھتے ہوئے آخر ایک دن کہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ تم بزدل لڑکی کر ہی کیا سکتی ہو۔" پھر وہ آہستہ سے ہنستا ہوا بولا۔ "چلتی ہو رائیڈنگ کے لیے"؟

"رائیڈنگ؟ اور وہ بھی تمہارے ساتھ۔ ہائے اللہ یہ آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو فاصی۔ یہ تمہیں رائیڈنگ کی اچانک کیا سوجھ رہی ہے۔؟

"اس لیے کہ اب میں مسلسل بوریت سے تھک گیا ہوں۔ تم نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی ہے؟ میں تو اپنے آپ کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ آؤ! ہم دونوں اس نیلے آسمان کے نیچے رنگ و بو اور حُسن سے سجی اس خوبصورت دنیا کو اپنی مسرتوں سے اور بھی حَسین تر بنا دیں۔"

"مسرتیں؟ شاید تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم زندگی کے اِن گھُپ اندھیر دل میں خود اپنے جانے پہچانے ہوئے راستے بھی کھو چکے ہیں۔"

"معاف کرنا شیما۔ میری الجھنوں نے تم کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ نازک سی کلی۔!

"میں کتنی حسرتوں سے اپنے معصوم خوابوں کو بکھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ دیکھتی ہو؟

کتنا مجبور بنا دیا گیا ہوں ؟ مگر تم اس بات کو یاد رکھنا کہ میں تمھاری پاکیزہ محبت کو ہمیشہ عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتا رہوں گا۔ میرے دل کی ہر ایک دھڑکن میں تمھاری یاد بسی رہے گی ۔ ! چاہے زمانہ مجھے جہاں بھی پھینک دے " !

سامنے باونڈری وال کے پیچھے ، اک پُر اسرار خموشی چھا کر رہ گئی تھی فیصل اپنی کوٹھی میں جیسے گم ہو کر رہ گیا تھا۔ شیما کو در و دیوار سہمے سہمے سے لگتے ۔ احاطے کے اندر درختوں پر بھی ایک سکوت طاری تھا ، طوفان آنے سے پہلے جس طرح فضاؤں میں ایک سکتہ سا آجاتا ہے ، ویسا ہی گھور اندھیرا شیما کے دل کی دنیا کو دہلائے جا رہا تھا۔ شیما کی خاموش محبت تو اس دور سے گزر رہی تھی جہاں دل کی دنیا کے ایک ایک ذرے کو اپنے محبوب پر سے لٹا دینے پر بھی تسکین نہیں ملتی ہے ۔ اس نے فیصل کو اپنانے کی کبھی تمنا نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ خُدا سے محبت تو کی جا سکتی ہے مگر اس کو کبھی پا نہیں سکتے ۔ اسی طرح فیصل کی اس محبت کی انتہا کو بھی اس نے اپنی آنکھوں کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے چھپا لینا چاہا تھا ، اپنے لہو کے قطرہ قطرہ میں اپنے پیار کی رچی ہوئی شادابی کو چپکے چپکے وہ محسوس کرتی رہی تھی اور جب کبھی وہ اپنی خموشی سے گھبرا جاتی تو اپنے رازداں ستار کے خاموش تاروں کو بند کمرے میں آہستہ سے چھیڑ دیتی اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں سے تاروں پر تھرتھراہٹ سی آجاتی ، ہلکی سی موسیقی کی اک کراہ بند کمرے میں سسک اٹھتی پھر آہستہ آہستہ دل کی چنگاریاں رات کے سناٹے میں در و دیوار سے ٹکراتی ہوئی فضاؤں میں شرارے سے بھرنے لگتیں ۔ اس کی انگلیوں کی جنبشوں میں شاید دیپک راگ جاگ اٹھا تھا۔ وہ تو بڑی سلجھی سلجھی سی معصوم لڑکی تھی جو زمانے کے ڈر سے اپنی محبت کا سارا درد و کرب ۔ اور اپنے خاموش جذبوں کے سارے اظہار اپنے ستار کے سینے میں چپکے سے اتار دینے کی عادی تھی ۔ اس کی

پلکیں بھیگ جاتیں وہ سسکتی ہوئی اپنے ستار پر جھک جاتی "خدایا ـ! محبت کی کونپلیں روح کی گہرائیوں کو سرشار کرتی ہوئی روشن تو بنا دیتی ہیں، مگر انھیں ہم اپنا نہیں سکتے ـــ پھر میں اتنی بلندیوں پر چمکتے ہوئے چاند کی تمنّا کیسے کر سکتی تھی ؟ !"

آخر ایک دن اچانک اداس اداس سا فیصل شیما کے کمرے میں آیا اس کی آنکھیں اک صحرا کی طرح خشک نظر آرہی تھیں، بڑھے ہوئے شیو میں اس کا سفید چہرہ بیمار بیمار سا لگ رہا تھا ـ وہ شیما کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا ـ

"آج میں تمھارا ستار بجا کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس میں پیار کی لہریں کیسے چھپائی جاتی ہیں ؟ میں ان نازک نازک سے کانپتے، کراہتے اور تھرتھراتے ہوئے تاروں سے ـ ڈھلتی ہوئی راتوں میں پُر الم سسکیوں کی کہانی سننا چاہتا ہوں ـ اور پچھلے پہر چاند کی زرد کرنوں میں جو تمنّائیں کراہ بن کر ڈوب جاتی ہیں میں انھیں تلاش کروں گا ـ شیما ! ـ لاؤ ـــ مجھے اپنا ستار دیدو !"

وہ خاموش سی لڑکی بس حیران حیران نگاہوں سے اُسے تکتی رہ گئی ـ فیصل نے اس کا ستار بڑے پیار سے اٹھا لیا ـ "دیکھتی ہو شیما ؟ میں تم کو تم ہی سے مانگ کر لیے جا رہا ہوں ـ" کاش ! میں ـــ اتنا بزدل نہ ہوتا ـــ !

فیصل بڑے کرب سے مسکرایا ـ "میرا رزلٹ نکل چکا ہے ـ ! اب میں ایک انجینئر بن چکا ہوں اور ـــ میں یہاں سے جا رہا ہوں شیما ـــ ؟ شاید میں باغی ہو گیا ہوں اسی لیے میں اپنی بزدلی سے کبھی بدلہ لینا چاہتا ہوں ـ ! شیما ! ـ تم کو کیا پتہ ؟ ـ کہ میرے قدموں میں کیسی کیسی زنجیریں پہنا دی گئی ہیں ـ سنو ! آج ہم ایک دوست کی طرح رخصت ہو رہے ہیں ـ میری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی ـ اور تمھارا یہ ستار، تمھاری امانت

اور میری زندگی کا ایک سہارا رہے گا ۔ اچھا خدا حافظ ۔ !!"

فیصل اپنے غموں کو اپنے افسردہ لبوں کی مسکراہٹوں میں چھپا کر چلا گیا ۔ نیلو نے سکھ کی سانس لی اور گھر کے لوگوں نے مرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے ہوئے اُسے رخصت کیا ۔

شیما کے ذہن پر فیصل کی وہی اجڑی اجڑی سی تصویر نقش ہو کر رہ گئی تھی ۔ ساری ساری رات اس کی بیکل سی گذر جاتی ۔ اب تو اس کے پاس تسکین دینے والا ستار بھی نہیں رہا تھا ۔ مگر اس کو خوشی تھی کہ وہ فیصل کے قریب تھی ، اس نے اپنے ستار کے نازک تاروں کو اپنا دھڑکتا ہوا دل بنا دیا تھا ۔

آم کے باغوں میں کیریوں کی خوشبو سے متوالی ہو کر کوئلیں کوکنے لگی تھیں ، فضاؤں میں نیم کے پھولوں کی ہلکی ہلکی سی خوشبوئیں پھیل چکی تھیں ۔ بچھیا ہواؤں میں جاتی ہوئی سردی کی ہلکی سی کپکپی باقی رہ گئی تھی ۔ صبح کا نکھرتا ہوا حسن دم بھر کے لیے اپنا جادو جگاتا ۔ دن بیتتے گئے پھر آہستہ آہستہ سورج کی کرنیں بلندیوں پر پہونچتے پہونچتے انگارے برسانے لگتیں ۔ ہواؤں کے جھونکے آگ کی لپٹیں بن جاتیں ، سڑکیں خاموش اور گلیاں ویران نظر آتیں ۔ مگر دھیرے دھیرے چمکیلی دھوپ مدھم پڑ جاتی ۔ زمین جیسے سانس لینے لگتی ۔ ہر طرف زندگی کی چہل پہل شروع ہو جاتی ، لان کے سبزے پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا ، کیاریوں میں بیلے کی سفید اور معطر کلیاں سبز پتوں پر جھلک اٹھتیں ۔ ہلکے ہلکے جھومتے ہوئے جوہی اور چنبیلی کی گھنی بیلیں سفید نازک کلیوں اور خوشبودار پھولوں سے لدی ، دلوں ، نگاہوں اور روحوں میں جادو سا بھر دیتیں ۔

آسمان پر سنہری اور نارنجی شفق جھلک اٹھتی ، پھر شام کا سرمئی آنچل فضاؤں پر

لہرانے لگتا۔ چڑیوں کی چہکار کے گھنگھروں سے بجنے لگتے اور آسمان پر، پرندوں کے کارواں اپنی اپنی منزلوں کی طرف اڑتے چلے جاتے۔ لٹی لٹی سی شیما انہیں دیکھتی اور محسوس کرتی رہتی مگر اب اس کی افسردہ نگاہوں میں کوئی انتظار نہیں تھا۔ اس کے ذہن و دماغ میں پہلے بھی جب کبھی تمناؤں کے خواب جھلکنے لگتے تو وہ مارے خوف کے اپنے دامن کو جھٹک دیتی۔ وہ اپنے خاموش جذبوں کے ساتھ اپنی روح کے تہہ خانوں میں اتر کر یہ سوچنے لگتی تھی کہ جب حالات نے اس کے قدموں تلے کوئی راستہ ہی نہیں بنایا تھا تو پھر منزل کی آرزو ہی کیوں ہو۔؟ بچپن میں ننھی ننھی انگلیوں والے ہاتھ کو تھام کر جس نے اُسے جینے کا انداز سکھایا تھا، اُس مقدس ہستی کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھے گی۔ مگر فیصل کی کھوئی کھوئی آنکھوں کا اضطراب اس کی لڑکھڑاتی ہوئی چال، اور اس کی شکست خوردہ سی مسکراہٹوں کو وہ کیسے بھلا سکے گی؟۔ اس کو اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ فیصل کہاں چلا گیا ہے اور نہ وہ کسی سے یہ پوچھ سکتی تھی، کیسا اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ویران دن اور اداس راتیں ہی اس کی ساتھی بن چکی تھیں۔!

ہمالیہ کی بلندیوں پر حسین گلپوش وادیوں میں لہکتے سبزوں خوبصورت نغمہ ریز آبشاروں، گیت گاتے چشموں اور پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر ٹھنڈی دھوپ سے چمک اٹھنے والے برف کے خیموں کو دیکھ کر فیصل کا دل بے اختیار فطرت کی صناعی پر جھوم جھوم اٹھتا۔ وہ سرو و شمشاد، چیڑ، دیودار اور چنار کے جنگلوں سے گذرتا ہوا کشمیر پہنچا تھا۔ اپنے زخموں کو بھول جانے کے لئے، شیما کے ہر نقش کو ذہن میں اجاگر کرنے کو وہ ایسی جگہ آگیا تھا جہاں کسی کا دباؤ نہ تھا جس جگہ نیلو کی منڈلاتی ہوئی نگاہیں نہ تھیں۔ وہ اپنے آپ کو ساری

دنیا سے بیگانہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ آرٹسٹ نہیں تھا۔ اس نے زندگی اور بہشواں کا کھیل کبھی نہ کھیلا تھا۔ مگر اب اس کے دل میں ایک حسرت تھی ایک پچھتاوا تھا کاش وہ شیما کی تصویر بنا سکتا، وہ بڑے غور سے کشمیری لڑکیوں کے فرن، ان کے ڈھکے ہوئے سروں، لٹکتی ہوئی اَنگنت چوٹیوں، کانوں میں بے شمار جھکی جھکی بالیوں کو دیکھتا تو اس کا جی مچل جاتا، شیما اگر اس کے ساتھ یہاں ہوتی تو وہ اسے کشمیری لڑکیوں کے لباس اور زیوروں سے سجاتا مگر زندگی سے بھرپور ان کشمیری لڑکیوں کی شوخیاں اُسے کہاں نصیب تھیں؟ وہ تو اپنے سائے سے بھی چونک اٹھنے والی لڑکی تھی جسے حالات اور زمانے نے اور بھی کچل کر رکھ دیا تھا وہ ایسی قیدی تھی جو نگاہیں اٹھا کر فیصل کو دیکھنے کی جرات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بیتے ہوئے لمحے جب فیصل کو بے چین کر دیتے تو پھر ستار کے تاروں پر اس کی انگلیاں کانپ جاتیں۔۔ تاروں پر پہلے آہستہ سے اک تھرتھراہٹ سی آجاتی پھر وہ ستار کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ریزوں کو اپنے غمگین سُروں میں بکھیر دیتا۔ خدایا۔ انسان اس حد تک بھی مجبور بنایا جا سکتا ہے؟ وہ اپنا ستار لیے دور دور نکل جاتا۔ کبھی جھیل ڈل کے کنارے بیٹھ کر اپنے لیے تسکین ڈھونڈتا کبھی گلمرگ اور پہلگام جا کر سکون کی تلاش کرتا۔ مگر اس کے دل کو کہیں چین نہ ملتا تھا۔

ایک دن ایسے ہی دریائے سندھ کی بیقرار پتھروں سے سر پٹکتی ہوئی موجوں کو دیکھتے ہوئے وہ ایک کنارے بیٹھا اپنے ستار پر افسردہ دُھن بجا رہا تھا۔ تو اچانک کسی نے شوخ لہجے میں پکارا۔ "ارے! جناب اتنی حسین اور کیف آور گھڑیوں میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی جھنکار سنا کر

ان خوبصورت لمحوں اور ہمارے موڈ کو کیوں خراب کر رہے ہیں"؟ فیصل نے پلٹ کر دیکھا کئی خوبصورت لڑکیاں اس کے پیچھے کھڑی اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بڑی خموشی سے ان فیشن زدہ لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ سب کی سب اس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئیں۔

"اچھا اب کوئی خوبصورت گیت اگیں نغمہ تو سنایئے۔"

"یہ کسی کی آہوں اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ساز ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسرت بھرا کوئی گیت آپ یہاں نہ سُن سکیں گی۔"

"اوہ! تو شاید جناب یہاں بن باس لینے آئے ہیں۔" لڑکیوں نے ایک شوخ قہقہہ لگایا۔

فیصل کی آنکھوں میں بیزاری سی بھر گئی۔ اس نے اپنا ستار اُٹھایا اور دوسری طرف چلا گیا۔ اس کا سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ لڑکیوں سے ریزرو ہو کر ملتا رہا تھا۔ اس کے شعور میں بچپن سے بس ایک ہی تصویر بستی رہی تھی، جو اپنی خوشبوؤں میں سمٹی ہوئی ایک نازک سی کلی تھی۔

کئی دنوں تک وہ اپنے ہوٹل کے کمرے سے باہر نہ نکلا۔ اندھیرے کمرے میں ہلکا سا بلب جلا کر وہ اپنی ڈائری لکھتا رہا تھا۔ بیتی گھڑیوں کی ایک ایک آہٹ اس نے سنبھال کر رکھی تھی ہر ایک نقش اس کے ذہن پر اتنا گہرا پڑ چکا تھا کہ وہ اپنی تنہائیوں کو انہی دیپوں سے اجال لیا کرتا ۔ مگر آخر وہ ایک دن اپنے کمرے سے گھبرا کر نکل آیا۔ جانے سے پہلے اپنا ستار اپنے میز پر ہی چھوڑ آیا تھا۔ اپنے اس محبوب ساز کو کسی کے مذاق کا نشانہ بنانا نہیں چاہتا تھا۔ پہلگام کی شام گرمی میں بھی خاصی ٹھنڈی تھی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ دریا کی موجیں آج بھی ہوا کی تیز لہروں سے اچھلتی سر پٹکتی بہتی،

چلی آ رہی تھیں۔ وہ اپنی ہرنوں میں کھویا ہوا تھا کہ ایک ہلکی سی آواز سُن کر چونک پڑا۔

" آپ بہت دنوں بعد آج آئے ہیں " فیصل نے دیکھا ایک دبلی پتلی سی لڑکی اس کے قریب کھڑی تھی۔

" آج آپ کا گروپ کہاں گیا؟ — وہ ہلکے سے مُسکرایا۔ ہرنوں کے اس ڈار سے آپ بچھڑ کیوں گئیں؟

وہ سُاری لڑکیاں گلمرگ چلی گئی ہیں، میں تھک گئی تھی اس لیے نہ جا سکی اس کی خوبصورت آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔

" آئیے!۔ یہاں بیٹھ جائیے، آپ اپنی دوستوں سے کچھ مختلف نظر آتی ہیں " فیصل کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

" آپ کو گلمرگ جانا چاہیئے تھا۔ کشمیر ان سارے حسین نظاروں کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ آپنے یہاں کے سُرخ لالہ کے پھول تو دیکھے ہوں گے۔؟ پھول کی صورت میں فطرت نے انھیں یاقوت کے پیالے بنایا ہے، نازک حسین جو صبح کو شبنم کے شرابوں سے مست ہو کر جھومتے رہتے ہیں "

" آپ نے تو شاعری شروع کر دی، لگتا ہے کہ شعر و شاعری سے آپ کی گہری وابستگی ہے "

" ایک انجینئر کو ادب اور شاعری سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے؟ مگر اس جگہ کی یہی تو جادوگری ہے کہ دیکھئے پتھروں سے بھی نغمے پھوٹ رہے ہیں " فیصل نے لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا، وہ کسی شاعر کے تخیل میں ڈھلی حسن کی پیکر تو نہ تھی، بس ایک عام سی لڑکی تھی جس کے لہجے میں مٹھاس تھی اور جس کی خوبصورت آنکھوں میں خلوص کی نرمی جھلک رہی تھی۔

" مجھے اداس چہرے بے چین بنا دیتے ہیں، میں نے آپ کی آواز میں آپ کے ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیوں کی چبھن محسوس کر لی تھی۔ اس جگہ آ کر بھی آپ اتنے افسردہ ہیں"؟

" میں اپنے آپ کو بھول جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن بھلا نہیں پاتا، میری زندگی جن بنیادوں پر قائم تھی، ان سارے نقوش کو اگر بھلا سکا تب ہی شائد میں بھی اک عام انسان جیسا بن سکوں گا۔ مگر ابھی تو ایک عجیب کرب کا عالم ہے، ساری تمناؤں اور محبتوں سے چھوٹ کر بے بسی میں ایک ستار کا سہارا لے کر زندگی کے دن کسی طرح گزار رہا ہوں۔ پھر بھی آپ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ میرے ستار پر غمگین لہریں کیوں تڑپ رہی ہیں"!

" مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہم لوگوں سے تکلیف پہونچی۔ پھر بھی یہ کہنے دیجئے کہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ خدا کا یہ عطیہ بس ایک ہی بار تو ملتا ہے"۔

"آپ کے مشورے کا شکریہ!"

فیصل جب اپنے کمرے میں ڈائری لکھنے لگا تو بار بار سیاہ آنکھوں والی لڑکی اس کو یاد آتی رہی جس کو فیصل سے ہمدردی تھی اور جس نے اس سے زندگی کا انداز بدلنے کو کہا تھا۔ اگر وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس نہ ہوتی تو وہ مہربان لڑکی کہیں زیادہ اچھی اور دلکش نظر آتی۔ اکیلے کمرے میں چپکے سے ایک مسکراہٹ فیصل کے لبوں پر کوند گئی ــ" وہ لڑکی کسی طرح کا لباس پہنے مجھے اس کی پرواہ کیوں ہو"؟ اور فیصل بہت سی ہونی اور انہونی باتوں کو سوچتے سوچتے سو گیا۔

دوسرا دن کہر آلود اور بہت ہی سرد تھا۔ برفانی علاقوں میں تیز ہوائیں برف کے تیز خنجر چلانے لگتی ہیں۔ اس نے دریچے سے باہر دیکھا پہاڑ کی بلندیوں پر ہمیشہ کی طرح برف کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ سردی سے کپکپاتا ہوا وہ کمرے

میں پڑا سوچتا رہا کہ آج کا دن کیسے گزارا جائے۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے دُھوپ کی سنہری کرنیں چمک اٹھی تھیں۔ آج بہت سویرے سے ہی اس کو اپنا گھر یاد آرہا تھا۔ شیما یاد آرہی تھی۔ ممّی کی آنسوؤں بھری آنکھیں اس کے خیالوں میں جھلکتی جا رہی تھیں، وہ کتنا خوش تھا اس جگہ، جہاں یہ سب کچھ تھا، جہاں چاہنے والے لوگ تھے جس جگہ محبت کرنے والی منتظر نگاہیں تھیں۔ شیما کی ننھی ننھی انگلیوں کو تھامے جس شہر میں وہ جوان ہوا تھا۔ پھر اس نے کون سا گناہ کیا تھا۔ جو اس کو اس کی جنّت سے نکال کر زندگی سے اتنی دور پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں "ممی! تم۔ تم کتنی سخت گیر ماں ہو۔ ؟ تم نے کتنی سخت دلی سے مجھ کو میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیا ہے، ممی! صرف تمھاری محبت نے آج مجھے اتنا بزدل بنا دیا ہے کہ میں نے تمھاری مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ لیکن ماں۔! فیصل مر چکا ہے دیکھو، تمھارا بیٹا اپنے آپ کو بھلانے کے لیے کس طرح بھٹک رہا ہے۔!" اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ اب اس کا دل پہلگام سے اکتا گیا تھا، وہ سون مرگ کے خوبصورت گلیشیر کو دیکھ کر کشمیر کی دوسری وادیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا ستار لیا۔ اور لالہ کے سرخ پھولوں کے یاقوتی پیالوں سے بچتا ہوا دریا کے کنارے اسی جگہ پہنچ گیا۔ کئی دنوں کے بعد اس کی انگلیاں تاروں پر دوڑ رہی تھیں، اس کے لب خاموش تھے مگر بولتی ہوئی آنکھوں میں اس کے جلتے ہوئے خوابوں کی چنگاریاں آہ بن کر فضاؤں میں شرارے بکھیر رہی تھیں۔ یہ تنہائی یہ جانی پہچانی تڑپتی ہوئی موجیں اس کی رازداں تھیں۔ ستار پر اس کی انگلیاں تیز سے تیز تر دوڑتی رہیں۔ اچانک اس کی نگاہوں میں رات کا پچھلا پہر جھلک اٹھا ایک معصوم سہما ہوا ابتت بھرا

دل، اپنی نازک تاروں کی لہروں پر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سموتا رہا تھا۔ اور اب فیصل کے لیے اس ہستی تک پہونچنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں کو تھام کر اپنی خوشیوں کو قربان کر دینے کا ایک عہد کیا تھا۔ مگر اسی وقت اس نے ایک اور اہم فیصلہ بھی کیا تھا کہ وہ اپنے آپ سے بھی انتقام لے گا۔ وقت، زمانے اور ممتا کی تمناؤں سے کہیں دور رہ کر وہ اپنی بزدلی پر اپنے آپ کو سنگسار کر دے گا اور وہ اسی لیے اتنے دنوں سے پتھروں سے ٹکراتا پھر رہا تھا۔ سکون کی اس کو تلاش نہیں تھی۔ انبساط و مسرت تو اس کو سُون مرگ جانے گئی تھی۔ آج فضا پر چھائے ہوئے دھندلکوں سے اس کو سون مرگ جانے نہ دیا تھا، وہ لمبے لمبے درختوں کے سائے کے نیچے کھلے میدان میں آکر ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ لوگ اپنی اپنی پسند کے گھوڑوں پر سوار ہو کر تفریح کے لیے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد گھوڑے کی ٹاپیں اس کے قریب ہی گونج اٹھیں۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "نمستے جی ۔ نمستے"۔ گھوڑوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں بڑی شوخ نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ لوگ؟"۔ اس نے ذرا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی جی ۔ مہاراج! بس یہیں تھوڑی دور تک اپنی اپنی رائڈنگ کا امتحان لینے جا رہے ہیں"۔ لڑکیوں کے گھوڑے جب ذرا دور نکل گئے تو وہ سیاہ آنکھوں والی لڑکی اپنا گھوڑا بڑھاتی ہوئی فیصل کے پاس آئی۔

ہلو ۔ ہلو ۔ آئیے! جناب آپ بھی گھوڑا لے کر ہم لوگوں کے ساتھ چلیں۔ آج کا موسم خاموشی سے گزار دینے کا نہیں ہے ۔ اور ۔! آج تو رائیڈنگ میں مزا آرہا ہے۔ کچھ نہ پوچھئے"۔ اس کی ہنستی ہوئی آنکھیں فیصل کے چہرے

پر کر گئیں ۔" اچھا ۔ جناب یہ تو بتائیے لڑکیاں گھوڑوں پر سوار اچھی لگتی ہیں نا؟ ۔ کیا خیال ہے آپ کا "؟

فیصل ہنس پڑا " ہماری مشرقی لڑکیاں رائیڈنگ کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں ۔ مجھ کو گھوڑے پر سوار لڑکیوں کو دیکھ کر بے اختیار جھانسی کی رانی اور چاند بی بی کی یاد آنے لگتی ہے ۔ یہ ہماری ہیروئیں ایسی تو نظر آسکتی ہیں مگر نازک سی لڑکیاں نہیں ۔"

اُوہ ۔ نُو ۔ نُو ۔ ! پلیز ۔ ایسا نہ کہیں ۔ وہ گھوڑے پر سے اتر آئی آپ اتنے مشرق پرست نہ بنیں ۔ ! اُوہ ۔ جناب معاف کیجیے گا ۔ اب تک میں آپ سے آپ کا نام بھی نہیں پوچھ سکی ہوں، مجھے تو سعدیہ حسن کہتے ہیں ۔" وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

" اور مجھے فیصل کہا جاتا ہے ۔" اچانک وہ بجھ گیا تھا ۔

سعدیہ حسن جب لڑکیوں کے ساتھ واپس چلی گئی تب فیصل نے بھی اپنا ستار اٹھایا ۔ اور وہ افسردہ سا اپنے ہوٹل چلا گیا ۔

کمرے کی تنہائیوں میں اس کو سعدیہ حسن کا بھولا چہرہ بار بار یاد آتا رہا ۔ اور اس کے ساتھ ہی شیما کی اداس صورت اس کی نگاہوں میں جھلکتی رہی ۔ وہ جو اس کی بچپن کی ساتھی، جوانی کی دوست اور اس کی تمناؤں کی مرکز بن چکی تھی ۔ کیا اب وہ ہمیشہ کے لیے اس سے خفا ہو چکی ہے ۔؟ اور اس طرح ہمالیہ کی اس برف پوش وادی میں وہ کب تک سسکتا رہے گا؟ اس کی یہ جنگ کبھی ختم بھی ہو سکے گی ؟ وہ اپنے آپ سے الجھتا رہتا جس نے اپنی زندگی کو مذاق بنا لیا تھا ۔ نیلو کی ہستی، گھر کے اندر پھیلا ہوا ایک تناؤ ۔ خاموش گفتگو ۔ نگاہوں میں طنز کے نشتر، آنسو ۔ التجائیں ۔ وہ

سبب کیا تھا؟ — دو معصوم دلوں کو کچل دینے والا کھیل، کس بے دردی سے کھیلا جا رہا تھا۔ فیصل کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، اس کا چہرہ تمتما گیا اور اس نے بڑے جوش سے ایکبار پھر اپنا عہد دہرایا — ممی —!! مجھ کو میری مسرتوں سے دور کر کے تم کبھی اپنے بیٹے سے اپنی خوشی نہ حاصل کر سکو گی؟" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا —!

پھر اچانک لاشعوری طور پر وہ ہفتوں سعدیہ حسن کے ساتھ اس حسین وادی میں گھومتا رہا، قہقہے لگاتا رہا — اس نے اپنے آپ کو بدل دیا تھا، گھنٹوں سعدیہ کا ہاتھ تھامے دنیا بھر کی باتیں کرتا چلا جاتا — وہ ایک دوسرے سے بہت قریب آچکے تھے، فیصل نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی ایک ایک ریزے اس کے سامنے رکھ دیئے تھے — وہ اس کی بچھڑی ہوئی محبت کا المیہ سنتی رہتی — اس کو زندگی کی اہمیت بتاتی رہتی — وہ ایک مہربان دوست بن کر اس کے دکھوں کی حصہ دار بننے کی آرزومند تھی —

فیصل سعدیہ کے ساتھ رائیڈنگ کرتا ہوا دور تک نکل جاتا اب سعدیہ کو فلیپر اور جینز میں دیکھ کر بھی کبھی ہنسی آجاتی تھی، یہی رُوپ اور یہی انداز شائد اس کے گھر کا مقدر بن چکا تھا اس کے لیے کیا تھا؟ وہ تو سنگسار ہو ہی چکا تھا — مگر قدرت اس کے خاندان کے ساتھ ایک انوکھا مذاق کر رہی تھی —!

ایسے ہی ہنستے مسکراتے دن گزر رہے تھے، جھیل ڈل کی بیقرار لہروں پر جگمگاتی اور شینوں کی ہل چل مچتی رہتی اور فیصل کے داغدار سینے میں شیما کے آنسو کے چراغ جلتے رہتے — فیصل کا دل روتا تھا اس کی آنکھیں جلتی رہتیں — مگر لبوں پر نقلی مسکراہٹوں کی رونقیں کھلی ہوتیں —

سعدیہ کے مہربان ہاتھوں نے اس کو سہارا دیا تھا — اور اب وہ اس تھوڑی

سی تسکین کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔

اور ابھی عروسی کمرے میں سجی سنوری دلہن کو دیکھتے ہوئے اس کے دل کے سارے ٹانکے یکبارگی ٹوٹ پڑے تھے۔ بیتی ہوئی یادوں کا لمحہ لمحہ اس کی نگاہوں میں جھلک اٹھا تھا۔ اس نے بڑی مایوس نگاہوں سے دلہن کو دیکھا۔ اور اس کے قریب آ گیا۔

"تم آرام کرو سعدی ۔۔ ! مجھے نیند نہیں آ رہی ہے" وہ قالین پر بیٹھ گیا۔ ! مہینوں کے بعد بے اختیار ستار بجانے کو اس کا جی چاہ رہا تھا۔ اس نے پھولوں کے ہار اور گجروں سے سجا ہوا ستار اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا، آج اس بد نصیب ستار کو بھی کسی نے سجا دیا تھا۔ فیصل نے ستار کے تاروں پر بڑے پیار سے اپنی انگلیاں پھیرنی چاہیں ۔۔

مگر بڑی آہستگی سے ایک تار ٹوٹ کر اس کے سامنے جھول پڑا فیصل چونک اٹھا۔ اس کی انگلیوں اور پھولوں کے درمیان ٹوٹا ہوا تار الجھا ہوا تھا۔

"شیما کہاں ہے؟ اور فیصل کا جی چاہا کہ وہ ایک بار پھر بے اختیار ہو کر پکارے ۔۔ !

۔۔ "شیما ۔ ! شیما تم کہاں ہو؟ ۔ مگر وہ پکار نہ سکا !! اور ٹوٹا ہوا ستار اس کی نگاہوں کے سامنے پھولوں سے ڈھکا ہوا ایک جنازے کی طرح پڑا تھا۔!

▬ ▬

چائے کی کلھیا

سشما نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے پہلے اپنے کپڑوں کو دیکھا، پھر اپنی برتھ اور اس کے بعد پورے ڈبہ کو دیکھا، گرد کی ایک ہلکی سی تہہ سکنڈ کلاس کے موٹے ہرے ہرے گدّے پر جم گئی تھی، اور اس کے کپڑے بھی گرد آلود ہو چکے تھے۔
"اتنا لمبا سفر" اس نے اپنے بھرے بھرے بازوؤں کو انگڑائی کے لیے اوپر اٹھاتے ہوئے سوچا "بنارس سے دلی جانا کوئی کھیل تھوڑا ہی تھا۔" انگڑائی لیتے ہوئے اس کا چہرہ انگاروں کی طرح دہک اٹھا، لبوں کی سرخی اور بھی تیز ہو گئی۔ اس کی انخلی سی آنکھوں میں آنسوؤں ایک نمی سی تیر گئی تھی اور اس کے سدا کے بے کیف اور پھس چہرے پر اچانک ایک دبی ہوئی مسکراہٹ چھا گئی۔ اس نے بڑے غور سے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھا تندرست، گداز اور ترشی ہوئی سفید انگلیاں اور ان انگلیوں کو دیکھتے ہی اس کو وہ سارے کام یاد آگئے جن کے بوجھ تلے اس کی نازک انگلیاں دبتے دبتے اب اتنی بھدی، سخت اور کھردری ہو گئی تھیں زمینداری کی گلابی گلابی بے رنگ اور روغن سی رسیدیں اور انشورنس کے تمام فارموں کو بھرتے بھرتے اس کی ناک میں دَم آگیا تھا۔ گھر کے ایسے سارے بیکار کام سب اسی سے کرائے جاتے تھے، جب بھی کالج سے مردھنس کر آتی تو ڈاک کا ایک ڈھیر اس کے آگے لگا دیا

جاتا اور بوڑھی ماں باپ کی چوکی پر ڈاک کی خبریں سننے کو بے قرار رہتی! اس کی زندگی میں کوئی موڑ، کوئی لہر اور کوئی لچک اب تک پیدا نہ ہو سکی تھی بس ایک سپاٹ سا سیدھا راستہ گھر سے کالج تک چلا گیا تھا اور اپنے کلاس کے بعد پھر وہ اسی راستے پر گردن جھکائے واپس آجاتی تھی۔ گھر اور کالج کے اندر حیات آفریں قہقہوں کی گونج میں اس کا سر چکرا اٹھا اور اس کی ابدی چڑچڑاہٹ عود کر آتی تھی۔ اسی لیے کلاس کی ساتھیوں اور خود اس کی اپنی بہنوں کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ کسی تیرتھ گاہ کی مندر میں دیو داسی بن کر دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ مگر کرشن جی کی مدھر راگ پر جھوم اٹھنا بھی تو اس کو نہ آتا تھا۔ پوجا کی تھالی میں آرتی کے جلتے ہوئے چراغ کو وہ اپنی پھونک سے بجھا تو سکتی تھی مگر اپنے ہاتھوں کو گردش دے دے کر روٹھے ہوئے بھگوان کو منانے کا پیار کہاں تھا اس کی نگاہوں میں۔؟ وہ اپنے جاڑے کی چھٹیوں میں دھوپ میں پڑی ہوئی سوکھتی رہتی تھی اور گرمی کی لمبی تعطیل وہ اپنے سب سے بڑے کمرے میں اکیلے خاموش ہر کسی سے الگ تھلگ رہ کر چوکی کے میلے فرش پر چت لیٹی لیٹی بڑے بے کیف طریقے پر گزار دیتی تھی۔ جب سے اس کی دونوں بہنوں کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی اور وہ دونوں رنگ و بو اور پھولوں سے سج سجا کر اس گھر سے چلی گئی تھیں تب سے اس کی چڑچڑاہٹوں اور بیزاریوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی اتھلی سی، نم بھری آنکھوں میں کسی ادھورے سے خواب کا سایہ تک نظر نہ آتا تھا۔ چاندنی راتوں میں گھر کے سارے لوگ جب باہر لان میں بیٹھے خوش گوار باتیں کرتے رہتے، یا آئے ہوئے مہمانوں کی تواضع ہوتی رہتی تو اس وقت بھی سب سے کنارے پر بیٹھی ہوئی سستا بیگانہ سی نگاہوں سے گھورتی ہوئی صرف اپنی انفرادیت کو پیش رکھتی تھی وہ جس رعب دار آواز میں گفتگو کرنے کی عادی ہو چکی تھی وہ اس

کی دوسری بہنوں کو بہت گراں گذرتا تھا مگر وہ حیرت زدہ سی پر شکوہ نگاہوں سے اپنی اس بڑی بہن کو دیکھ کر اداس دل کے ساتھ خاموش رہ جاتی تھیں۔ دن بدن وہ ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ کالج سے واپس آکر کبھی پلٹ کر کسی نے اس کو اپنی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ باورچی کے بھاگنے پر جب بھی اس کی بہنیں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کالج جانے سے پہلے یا واپس آکر مشکلوں سے کھانا پکاتیں تو سشما کھانے کی میز پر اترا بھی نہیں محسوس کرتی کہ آج کون سی چیز پکی تھی اور کس نے کھائی تھی بس جیسے وہ ایک عادت سے مجبور ہو کر کھانے پر آگئی تھی۔ مسہری کا پردہ سارے سارے دن جھولتا رہتا تھا اور رضائی کا ڈھیر اس کے پلنگ پر صبح سے شام تک ایسے ہی پڑا رہتا مگر اس نے کبھی ان کی طرف توجہ دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ اکتائی ہوئی سی اپنے دونوں پیر کرسی پر اٹھائے بیٹھی ہوئی دیر دیر تک نیلے آسمان پر اڑتی ہوئی چیلوں کو دیکھتی رہتی مگر جب اس کی نگاہیں تھک کر نیچے جھک آتیں تو پھر دور دور تک کسی انتظار کا نام و نشان تک نہ ہوتا تھا۔ بی ٹی کے رزلٹ میں اس کا نام کہیں نہیں تھا۔ گھر کے لوگوں کو افسوس سے زیادہ حیرت تھی۔ مگر سشما کے خاموش چہرے پر کوئی اثر نہ تھا وہ ہر روز کی طرح ویسی ہی بے پروائی سے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہوئی گرما گرم چائے کی دو دو پیالیاں پیتی رہی۔ اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ اٹھی اور اپنے کپڑوں کی الماری کھول کر اپنے ہاتھوں سے کسی زمانے کے بنے ہوئے سوئیٹروں کو دھڑا دھڑ کھولنے لگی۔ سمٹے سمٹے ہوئے کئی طرح کے بدرنگ اون کا ایک ڈھیر پلنگ پر لگ گیا تھا اور پھر وہ الگ الگ رنگ کے پرانے اون کا گولا بنا کر رکھتی چلی گئی۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں ہنستی ہوئی نگاہوں سے یہ تماشا دیکھتی رہیں اور بوڑھی ماں بھگوان

کی مورتی کے آگے لال پیلے رنگ کے پھول چڑھائے ہاتھوں کو جوڑے بلک بلک کر کہتی "بھگوان سشما کے دن بھی پھیر دو اس کے لیے بھی سہرے کی دو کلیاں کھلا دو" مگر سہرے کی کلیاں جہاں بھی کھلتی نظر آتیں طوفانی بگولے انھیں پھیلا دیتے تھے، ماں کی نگاہیں بلندی پر تھیں۔ بی ٹی کے امتحان میں فیل ہو کر سشما مستقل طور پر گھر میں بیٹھ گئی تھی، اور بوسیدہ سے پلاسٹر جھڑتے ہوئے مکان کے در و دیوار پر ایک اور بوجھل سی خاموشی کا اذیت رساں احساس چھا کر رہ گیا تھا۔ گھر کے کونے کونے ایک بیمار اور نڈھال سی انگڑائی لیتے ہوئے محسوس ہوتے اور اسی تھکن میں سشما کا انگ انگ بھی ٹوٹتا ہوا سا لگتا تھا کئی دنوں تک الجھے ہوئے بالوں کا ایک گھونسلہ سا اس کے سر پر لگا رہتا۔ مگر جیسے وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

گھر کے اندر ٹھاکر دوارے کے کونے میں دھوپ صندل اور گنگل کی دھونی کا گہرا اسرمئی اور پیچ و تاب کھاتا ہوا دھواں دن میں دو بار لہراتا۔ بوڑھی انگلیوں سے بجتی ہوئی گھنٹیوں کی کمزور آوازیں نکلتے ہوئے سورج کی نحیف شعاعوں اور سسکتی ہوئی شام کے اندھیروں میں تھوڑی دیر کے لیے ایک تھرتھراہٹ سی پیدا کر کے مٹ جاتیں، اور صبح کے چڑھائے ہوئے پھول شام کو اور شام کے وارے ہوئے پھول صبح تک اپنی دلکشی حسن اور بہار کی ساری رعنائیاں دیوتا کے قدموں پر لٹا لٹا کر مرجھا جاتے، اور سیندور کے لال لال نشانوں پر بھی گرد کی ایک دھندلاہٹ سی آجاتی تھی مگر کرشن جی کا گہرا سانولا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح سے مسکراتا رہتا۔ بے آواز کی بانسری جیسے فضا میں بجتی ہوئی لہراتی اور کسی ملکوتی نغمے کی آواز لیے پر سشما کی ماں جھوم جھوم کر اپنی تمناؤں کے جلتے ہوئے چراغ کی آرتی لیے، مورتی کو رجھاتی، اس کو مناتی، اور پھر اس سے سہرے

کی دو کھلی ہوئی کلیوں کی بھیک مانگنی اور ایک دن آخر کرشن جی کے مُسکراتے ہوئے لبوں پر بڑی پیار بھری شفیق مسکراہٹ آ ہی گئی اور ایک ہی ساتھ دمکتی اور دہکتی ہوئی سہرے کی چار کلیاں ان کے قدموں پر لہک اٹھیں۔ سشما اوندھی پڑی سوتی رہی ۔۔۔ اور ہنستی مسکراتی اپنے رنگین آنچلوں کو پھڑپھڑاتی ہوئی آ کر چنچل اوشا اور اوما نے بھگوان کے چرنوں پر سے ان کھلتی ہوئی کلیوں کو بڑے ناز اور بڑی مسرت کے ساتھ ایک ہی بار میں چُن لیا تھا اور دو دو کلیاں اٹھا کر ..... جب وہ اٹھلاتے ہوئے قدموں سے واپس جانے لگیں تو ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ان کا اچھوتا کنوارپن شرما رہا تھا۔ بھگوان کے قدموں پر سے ماں نے جب اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو اٹھا کر چونک کر دیکھا تو بڑے کمرے میں فرش کے اوپر سشما بے خبر سو رہی تھی اور ہمالیہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ کی ڈھلوان اور پھسلتی ہوئی بلندیوں تک پہنچنے کے راستے سے کتنے شوقین جانباز لڑھک کر گر چکے تھے اور اسی ایورسٹ کی اچھوتی چوٹی پر سے اڑتے ہوئے جہاز ایورسٹ کا اجاڑ برف سے لدا ٹھنڈا سینہ دیکھتے ہوئے اس پار اوشا اور اوما کو لینے آ گئے تھے۔ اب گھر کا سونا پن اور بھی بڑھ گیا تھا، اور سشما کا دن بہ دن پھلتا پھولتا ہوا جسم بے رونق چہرہ اور الجھے ہوئے بے رنگ بال اس کی ماں کی دھندلی نگاہوں سے اوجھل ہوتے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑے غور سے سشما کی بھدی سی بھاری آواز کو سنتی اور پھر تھوڑی دیر کے لیے اس کا دل ڈوبنے لگتا کس کا کتنا اثر آواز پر پڑتا ہے۔ پرانا گھر رفتہ رفتہ اور بھی ویران ہوتا جا رہا تھا، ماں کی انگلیاں دیوتا کے آگے گھنٹی بجاتے وقت اس حد تک کانپنے لگی تھیں کہ بھگوان نے جیسے کبھی ان آوازوں کو سنا ہی نہ تھا۔ اور اب سشما گھنٹوں

میلے فرش پر کبھی چت اور کبھی پٹ بے خبر سوئی رہتی تھی " کم سے کم تو بی۔
ٹی ہی پاس کر لیتی سشما تو تیری جوانی اس طرح سے ایڑیاں رگڑتے رگڑتے
تو نہ گزرتی " ماں کی دھندلی نگاہوں کے ساتھ گھر کی ٹوٹی ہوئی محرابیں
بھی جیسے یہی کہتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

اور آخر کار اچانک ایسے مردنی چھائے ہوئے سکوت میں زندگی کا
ایک ہچکولا آیا۔ تڑختے ہوئے پلاسٹروں اور ڈولتے ہوئے فرسودہ کیواڑوں
اندر گھر کے کونے کونے کا دل اس طرح دھڑک اٹھا جیسے بگڑی ہوئی گھڑی
ذرا سی ٹھیس لگنے سے اچانک چلنے لگے۔ ماں نے اپنے بچھڑے ہوئے شوہر
کی محبت کو یاد کر کے اس کے دوست کے لڑکے کو ام۔ اے کا امتحان دینے
کے لیے بڑی شفقت سے ٹھہرا کر گھر کا وہی کمرا اس کو دیا جو کچھ غنیمت سا تھا۔
دن بھر وہ کمرے میں اپنی ساری چیزوں کو ٹھیک کرتا رہا تھا، اور ہر روز
کی طرح سامنے برآمدے میں ٹوٹی ہوئی ہاتھ والی کرسی پر بیٹھی سشما اپنی
ادھ جلی آنکھوں سے اس کو اپنی کتابیں، جوتے، کپڑے اور بستر کو ٹھیک
کرتے ہوئے ایک تماشہ کی طرح دیکھ رہی تھی۔ اس کو گھر کے اندر اچانک اس
طرح سے چھا جانے والی تبدیلی سے ایک الجھن اور پریشانی لگ رہی تھی، ایک
نیا ماحول خواہ مخواہ اس کے اپنے گھر میں اس کی مرضی کے خلاف بن رہا تھا۔ گھر
کے سنّاٹے میں تیز پاور کے جلتے ہوئے بلب نے اس ویرانے میں تھوڑی سی
رونق پیدا کر دی تھی۔ سشما کی نگاہوں میں وہی پرانا بیگانہ پن چھا رہا
تھا، مگر وہ اجنبی آنکھیں بڑی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ چائے کی ادگھتی ہوئی
پیالیوں میں سے ایک جیتی جاگتی گرما گرم پیالی جب وہ ہمدرد کے گورے
گورے ہاتھوں میں تھماتی تو اس کا جی تلملا جاتا۔ کیا بے ہنگم سے کام اب اس

کو کرنے پڑ رہے ہیں اور پھر ادشا اور اوما کی چہکتی ہوئی زندگی کو خیال کر کے اس کا جی چاہنے لگتا کہ ایک جھٹکے سے وہ اس ڈگ ڈگ کرتے ہوئے بے رنگ ورو غن میز کو گرا کر چور چور کر دے ۔ صرف ایک ہی کمرے میں رہنے کے باوجود ہمندر کا نشان گھر کی ساری چیزوں پر تھا ۔ اس کے پالش لگے ہوئے جوتے برآمدے کی دھوپ سے چمک اٹھنے کے انتظار میں پڑے رہتے تھے آنگن کی الگنی پر اس کی بنیائن سوکھتی تھی ، قمیص لٹکی رہتی تھی ۔ اور سلیپنگ سوٹ پھیلے رہتے تھے ، جہاں پر بھی اس کا جی چاہتا لال کالی اور ہری جلدوں والی چکنے کاغذ کی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے وہ ایسے ہی چھوڑ دیا کرتا تھا اور سشما کا جی اس وقت جل کر جیسے خاک ہو جاتا جب ہمندر ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ذرا لاڈ دکھا کر کہتا " سشما دی دی ذرا میز پر سے میرا پن تو لا دیجئے "۔ دل کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تو وہ پہلے ہی بھسم ہو چکی تھی مگر یہ لڑکا تو اپنی پھونک سے اس کی راکھ تک کو مٹا کر رکھ دے گا ۔ " ہونہہ " آخر سہتے سہتے ایک دن وہ بول ہی پڑی ۔ " اچھی مصیبت پال رکھی ہے آپ نے ۔ جیسے میں کوئی خریدی ہوئی لونڈی ہوں کسی کی ، یہ کیجئے وہ کیجئے ۔ کسی نوکر سے بنوا دیجئے گا شام کی چائے ، مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب کچھ ' چائے میں اور چینی دیجئے ' ، دودھ کم ہے ۔ پھر جوتے کا خیال رکھوں اور کپڑوں کو ٹھیک کرتی پھروں " دھندلی آنکھوں والی ماں بس چپ چاپ سے اس کی باتیں سنتی رہتی اور شام کو جب نوکر چائے بنا کر ہمندر کو دے آیا تو ایک ہی گھونٹ پی کر وہ پیالی لیے ہوئے سشما کے پاس چلا آیا ۔ سشما دی ۔ آج یہ نوکر مجھ کو چائے بنا کر کیوں دے گیا ہے ، میں تو آپ کے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چائے پینے کا عادی ہوں " وہ اتنے مٹھاس اور اتنے

بھولے پن سے بولتا کر سشما کے چہرے پر کبھی کبھی ایک تمتماہٹ سی آجایا کرتی تھی، یہ لڑکا کتنا ڈھیٹ تھا۔ وہ جان کر اپنی کرسی کو اس کی چوکی سے قریب کر لیتا، کبھی وہ اس کے لیے کالج سے میگزین لیتا آتا کبھی رنگین ٹافی کے ڈبے لا لاکر اس طرح سے اس کو دیتا جیسے اتنے بڑے گھروندے میں دو بچے اکیلے کھیلتے کھیلتے گھبرا کر ایک دوسرے کو بہلا رہے ہوں۔ فرش پر لیٹے لیٹے بہت سی باتیں اس کو یاد آنے لگیں۔ ہندر۔ ہندر سے پہلے یہاں کیا تھا؟ بس سسکتے ہوئے دن تھے اور روتی ہوئی راتیں؟ دن بھر میں ایک ہی بار سہی مگر اب وہ اپنے بالوں کو درست کرنے لگی تھی۔ اور سب سے نئی بات تو یہ ہوئی تھی کہ ادب، کلچر، تاریخ، سیاست اور دنیا بھر کے عنوان پر ہندر اس سے گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا، شاید اس کو سشما کے چہرے پر اس کے اندرونی نقش کا ایک ہلکا سا عکس بھی نظر نہ آتا تھا اور اس کی بیگانہ سی تلخیوں بھری نگاہوں کو وہ کبھی محسوس نہ کر سکا تھا کہ اچانک سشما کو ہندر کے آئینے میں اپنا ایک دوسرا رخ نظر آیا۔ وہ اپنے آپ سے حیران تھی جیسے کسی تپتے ہوئے صحرا میں اچانک پانی کا چشمہ چھلک پڑے۔ اس کے ویران دل میں خلوص کا سوتا پھوٹ بہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اتنے بے اختیار آنسو بہتے چلے گئے جیسے اپنی نگاہوں کی ساری تلخیوں کو وہ دھو کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار وہ اتنی خوشی سے مسکرائی۔ وہ آسمان کے نیلے رنگ کو تکتی ہوئی سوچتی کہ جب ہندر نہیں تھا تب کیا تھا؟ اور جب ہندر نہیں رہے گا تب کیا ہوگا؟ اور اتنی پھیلی ہوئی کائنات اس کی روح کی اپنی سرگوشیوں بھری آواز میں کوئی تسکین نہیں دلا سکتی تھی۔ ہندر نے رفتہ رفتہ اس کو اپنے چھوٹے چھوٹے کام کرانے کا عادی بنا لیا تھا، اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے تھک کر

جب مہندر بڑے پیار سے اس کو پکارتا "سشما دی" تو وہ برآمدے میں بیٹھی یا بڑے کمرے میں لیٹی لیٹی مسکرا دیتی یہ آواز اس کی روح میں اترتی چلی جاتی تھی۔ اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے بہت دور سے کوئی ہمکتا ہوا بچہ تھک کر اس کی گود میں سو جانے کو بے قرار ہے۔ اور اسی پیار سے وہ گھنٹوں اس کے بالوں کو دیکھتی، اس کے چہرے کو تکتی اور پھر دن میں کئی کئی بار وہ اس کو گرم گرم چائے پلایا کرتی اور جب وہ پڑھتے پڑھتے کتاب سے منہ کو ڈھانکے ہوئے سو جاتا تو وہ چپکے سے جا کر اس کی مسہری کا پردہ گرا کر لائٹ بجھا دیتی۔ مگر جب ایک دن امتحان سے واپس آ کو مہندر نے اپنے پسینے سے بھیگی ہوئی قمیض ٹبی لگا دینے کو پھینکی تو سشما نے مہندر کے ننگے سینے کو دیکھا۔ جو تصور اس کی آنکھوں میں ہمک ہمک کر پل رہا تھا، اس سے یہ مہندر کتنا مختلف تھا۔ خوبصورت سی گردن کے نیچے پھیلا ہوا اتنا سفید اور چوڑا سینہ، اور پھر اس کے سینے پر کالے کالے بالوں کو دیکھ اس کی نگاہیں شرما کر جھک گئیں، قمیض اس کی گود میں پڑی تھی اور اچانک وہ تیز بو ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ اس کے دل و دماغ اور روح کی گہرائیوں میں سماتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر انگارے سے دہکنے لگے اور صحرائی بگولوں کی طرح تپتی ہوئی اس کی سانس میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگی تھیں، کرسی کی پشت پر وہ آہستہ سے لیٹ رہی، دل کی تیز دھڑکن کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کو کچھ سکون ملا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے اپنا سر اور چہرہ دھویا اس کا اترا ہوا چہرہ اور چڑھی چڑھی سی گلابی آنکھوں کو دیکھ کر مہندر نے اس کو خاموشی کے ساتھ سو جانے کا مشورہ دیا اور پھر اپنے کمرے سے سینٹ اور لونڈر کی شیشیاں لا کر اس نے سشما پر چھڑک دیں۔ اس کی آنکھیں ابھی تک جل رہی تھیں۔ اور بھینی بھینی خوشبوؤں میں

لپیٹ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا وہ ابھی تک زندہ تھی؟ عمر کے تینتیس سال ایک ویرانے میں گزار کر بھی اس کے بھدّے سے جسم کے اندر کوئی سشما ابھی تک زندہ رہ گئی تھی؟ اس نے اپنی سفید انگلیوں کو خود اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اچانک چوم لیا۔ اس پر سے گزرا ہوا ایک طوفانی جھونکا اس کے زنگ آلود دریچوں کو کھول کر چلا گیا تھا۔ اس کو اپنے آپ سے محبّت کرنے کا جی چاہا، اپنے کو پیار سے لپٹا لپٹا کر چوم لینے کو اس کے لب پھڑپھڑائے۔ وہ اتنے وسیع ریگستان میں بھوکی پیاسی رہ کر بھی کیسے ابھی تک زندہ تھی! اور جب وہ اپنے آپ کو کسی طرح سے پیار نہ کر سکی، تو اس نے مہندر کی پسینے سے مہکتی ہوئی قمیض کو اٹھا کر چوما اور اپنے سینے سے لپٹا لپٹا کر پیار کرتی رہی۔ اب وہ مہندر کے کمرے میں جاتے ہوئے ٹھٹھک سی جاتی تھی، چائے کی پیالیوں کو تھماتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے، اور مہندر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی نگاہیں تھرتھرا جاتی تھیں، اور ٹھیک ایسے ہی وقت میں جبکہ مہندر کی آنکھوں نے اس کو جلایا تھا، مہندر اسی پیار بھرے لہجے میں سشما دی کو جگا جگا کر امتحان دینے کے بعد چلا گیا تھا۔ گھر کے ویرانے اپنی جگہ پر آ گئے تھے مگر اب سشما کی تنہائیوں میں ایک خمار آ گیا تھا گھر کے ان سناٹوں میں گزرے ہوئے دنوں کا ایک گہرا نقش پڑ چکا تھا اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ مہندر نے اپنی ساری یاد اس کی نگاہوں میں بھر دی تھی۔

وہ اپنی بیمار بہن اوشا کو دیکھنے دہلی جا رہی تھی، مہندر نے لکھا تھا کہ وہ علی گڑھ کے اسٹیشن پر اپنا سارا کام چھوڑ کر اس سے ملنے ضرور آئے گا۔ گاڑی جیسے ہی علی گڑھ کے اسٹیشن پر رکی اس کے دل اور روح کا سارا انتظار اس کی آنکھوں میں سمٹ کر آ گیا وہ کسی دلھن کی طرح شرمائی ہوئی نگاہوں سے پلیٹ فارم

پر مہندر کو ڈھونڈنے لگی اور جب ایک ہجوم میں سے ہوتا ہوا مہندر کا
خوبصورت چہرہ اس کے بالکل قریب دریچے کے پاس آگیا تو بے اختیار اس
کا جی چاہا کہ وہ اس کو چوم لے۔ کتنے بے چین دن اور راتوں کو گزار کر اس
نے مہندر کو دیکھا تھا اور مہندر کی آواز میں ابھی تک وہی پیار بھرا ہوا
تھا اس کی آنکھوں سے وہی اپنائیت اور خلوص جھلک رہا تھا۔ مہندر کو
دیکھتے دیکھتے اس کے اندر انگڑائیاں لیتی ہوئی زندہ سشما جاگ
اٹھی تھی۔ مہندر کی ان ہی تیز نگاہوں کی چبھن سے مری ہوئی سشما
کے اندر سے دھڑکتے ہوئے دل والی عورت جنم لے چکی تھی۔ وہ مہندر کو
بس دیکھتی رہی، اور مہندر نہ جانے کیا کیا اور کہاں کہاں کی باتیں اس
سے کرتا جا رہا تھا۔ وہ صرف اس کے مسکراتے ہوئے لبوں اور ہنستی ہوئی
آنکھوں کو بس دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ یکایک چونکی۔ مہندر مٹی کی
کوری پیالی میں اس کو چائے دے رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔
"میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے کا بدلہ چکا رہے ہو۔" ہنستے ہوئے جھک کر
اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور اس کے بالوں کی لٹ پیشانی پر
لوٹتی ہوئی چائے کی خاکی سطح پر جھکی، اس کے کالے بالوں میں سفید بال
مٹی کی کلھیا میں تیر رہے تھے جیسے بڑی گہری نیند سے چونک کر سشما
نے بڑی لجاجت اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے ایک مجرم کی طرح مہندر
کی طرف دیکھا اور مہندر کا چہرہ رینگتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ساتھ کچھ دور
تک چلتا چلتا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

— ٦ —

سلمتا

"رم جھم رم جھم چال تمہاری" ادھ کھلے دریچے سے ٹکرا ٹکرا کر یہ لہکتی ہوئی آواز باہر کے برآمدے میں گونج رہی تھی۔ اور دیوار کے ایک کونے سے اپنی چوڑی بیٹھ جمائے اور اپنے چھوٹے، موٹے، بھدے پیروں کو پھیلائے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا سلمتا گانے کی آواز پر اپنے جھبڑے جھبڑے بال آگے پیچھے لٹکاتا ہوا جھوم رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے پیلے رنگ کے کھرپے سے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور گالے کے گوشت کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں مٹر مٹر سامنے تک رہی تھی۔ بند کمرے کے اندر سے سگریٹ کے تیز بھبکے کے ساتھ گانے کی آواز چلی آ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سلمتا بھی جھوم جھوم کر آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ "رم جھم رم جھم چال تمہاری"۔ گہرے رنگ کے پردے کے پیچھے سے گاتے گاتے لچا یک انگریزی کی پھیکی دار آواز بھی آنے لگتی تھی ـــ ہر روز یہی ہوا کرتا تھا۔ گانے کی تیز آواز گونجتی، پھر لوجک کا کوئی خاص فارمولا یاد ہونے لگتا۔ چند منٹوں کے بعد تکیہ پر گھمہ مارنے، ہاتھ پیر پٹخنے اور لمبی لمبی سانس لینے کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایک دم سے کمرے کے اندر سناٹا چھا جاتا تھا ـــ سلمتا اس گھر کا ملازم تھا مگر اس کا اپنا خیال تھا کہ لوگوں نے اس کی قدر نہ کی، اچھا بھلا سا نام بھی اس گھر میں آ کر سلامت علی خاں کی جگہ سلمتا بن کر رہ گیا تھا، مگر کیا کرتا بیچارہ، پیٹ تو بہر حال بھرنا ہی تھا،

دوسرے فلمی گانوں کا شوق اسے گھر جانے بھی نہ دیتا۔ سلمتا کو صرف اچھے اچھے گانوں کا شوق تھا، لوبک کے نار مولوں، ہاتھ پاؤں پٹکنے، یا منہ ٹیڑھا کرکے انگریزی بولتے ہوئے دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی — گھر بھر میں اسکو سب سے اچھے جاویدی بابو لگتے تھے۔ ہر روز وہ انہی سے نئے نئے فلمی گیت سیکھا کرتا تھا، مگر اس کو جاویدی کی اس عادت سے بڑی چڑھ تھی کہ جہاں وہ اپنے کاموں سے جیسے تیسے فراغت پاکر جاویدی کے کمرے کے قریب بیٹھتا اور گانے کی آواز پر دھیان دینے ہی لگتا تھا کہ گانے کے ساتھ ہی ساتھ بادل سے گرجنے لگتے تھے دم بھر کو، کسی کسی گانے کی للچائی ہوئی آواز آتی : لو بھئی، پھر وہی گڈ مڈ، گڈ مڈ، ہا، ہو، ہا، ہونے لگ جاتی، اور اس کے بعد ایکدم سے سناٹا چھا جاتا۔ اسی لیے اتنی کوشش پر بھی بچارے سلمتا کو کوئی گانا پورا نہ آتا تھا۔ اور اس کا جی تڑپتا رہتا کہ کوئی گانا اس کو ایسا یاد ہو جاتا کہ جس کو دوپہر کی چھٹی میں، گنگا کے کنارے، دھوپ میں بیٹھ کر وہ لہک لہک کر گاتا اور محلے کے سارے چھوکروں پر اس کا رعب پڑ جاتا۔ سلمتا کو دھوپ کی گرمی سے ایک خاص لگاؤ تھا، کبھی کبھی جب اس کا موڈ اچھا ہوتا تو گرم گرم پختہ فرش پر کمبل لپیٹے گھنٹوں وہ صحن میں پڑا رہتا تھا۔

جاویدی کا کمرہ آخری کونے پر تھا، کمرہ کوئی خاص بڑا نہ تھا مگر اس میں دو دروازے اور تین دریچے تھے۔ اور اسی مختصر سے کمرے میں دو پلنگ، دو میز اور دو کرسیوں کے ساتھ دو بک شیلف رکھے ہوئے تھے، اور مختلف قسم کے جوتے بھی اسی کمرے کے ایک کونے میں رکھے تھے۔ سلمتا جاویدی سے کبھی نہ ڈرتا تھا، مگر انور بابو کا غصہ وہ دیکھ چکا تھا۔ پھر کہاں وہ جاویدی ایسا دلچسپ آدمی اور کہاں انور جیسا خشک طبیعت کا انسان، جب سے انور جاویدی کے کمرے میں آگیا تھا، سلمتا کو الجھن ہونے لگی تھی۔ پہلے جب جاویدی اس کمرے میں اکیلا تھا، تو سلمتا کا راج تھا۔ جب

جی چاہا، خوشبودار تیل کے چھوٹے سر پر تھاپ لی، جاویدی کے اس کمرے کا جغرافیہ وہ پورے طور پر جان چکا تھا۔ تیل، کنگھی اور آئینہ کون کون سی جگہوں میں ملیں گے، وہ سب کی خبر رکھتا تھا اور یہ ساری احتیاطیں صرف اسی کی خاطر برتی جاتی تھیں، بک شلف کی کتابوں کے پیچھے، ٹھنسے ہوئے میلے کپڑے کے اندر، تصویر کے پیچھے، روشندان کے اوپر، اور بستروں میں دبکی ہوئی چیزیں، جب کبھی سلمتا کو لینے لئے ضرورت پڑتی وہ ان ساری چیزوں کو پا لیا کرتا تھا، طرح طرح کے بلیڈ بھی اس کو انہی جگہوں میں ملتے تھے۔ اگرچہ شیونگ سامان اس کمرے میں مختلف جگہ پر عجیب عجیب شکلوں میں پڑا ہوا ملتا تھا، مگر وہ ان سب کو کسی نہ کسی طرح سے اکٹھا کر کے اپنے چہرے پر پھیر ہی لیا کرتا، اور بلیڈ کی پتی پھر اس کی جیب میں چلی جاتی تھی، اسی ایک بلیڈ سے اس کو بے شمار کام بھی تو کرنا پڑتا تھا، کسی کا کرتا پھاڑ دیتا، کسی کی انگلی چیر دیتا، محلے بھر کے ناخن اسی بلیڈ سے بنتے، پھر باورچی کو چڑھا چڑھا کر اسی گندے بلیڈ سے وہ ترکاری بھی کاٹنے لگتا تھا۔ مختلف ڈیزائنوں کی مونچھیں بھی اسی سے بنتیں، اور کسی دوست کی داڑھی بھی اسی بلیڈ سے سنواری جاتی تھی۔ اس گھر میں رہتے رہتے سلمتا کو چھ سال ہو گئے تھے مگر وہ جیسے کا تیسا تھا، بال برابر بھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ بس ذرا سر اور جسم کی چوڑائی پہلے سے زیادہ نظر آتی تھی، صرف اس کا بھاری سر اس کے سن کا پتہ دیتا تھا، ویسے اس کے ہاتھ اور پیر بہت ہی چھوٹے چھوٹے سے تھے، وہ بچارہ کبھی بونا کہہ کر بلایا جاتا، کبھی بن مانس کا خطاب پا کر ہی اپنے پیلے پیلے دانت باہر نکال کر ہنسنے لگتا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سلمتا ہنسنے کے علاوہ اپنے دانتوں سے سننا اور سوچتا بھی ہے۔ گلی کے جتنے چھوکرے تھے سب ہی اس کے جگری دوست تھے، لیکن اگر کوئی دوست اس پر ذرا بھولے سے بھی ہنستا تو اس کی اچھی خاصی مرمت ہو جاتی۔ گھر کے اندر جہاں کسی نے ذرا سا ڈانٹا، بدتو اس

کی قسمت کھل جاتی تھی، سارا کام چھوڑ چھاڑ وہ نالے اندر گھس کر سو رہتا اور کبھی تو درخت کے اوپر شاخوں سے لپٹ کر بھی اس کو بڑی گہری نیند آجاتی تھی۔ ڈھونڈنے والے تھک کر ہار بھی جاتے اور وہ بڑی معصومیت کے ساتھ سوتا رہتا تھا۔

وہ دیہات کا ایک آزاد چھوکرا تھا، اس کی زندگی ایک لنگوٹی پہن کر بھینس کی پیٹھ پر ہٹ ہٹ کرتے ہوئے شروع ہوئی تھی، مگر اب اس نے بڑی تیزی سے اپنے آپ کو بدل دیا تھا، خوشبودار تیل سے اس کے بال بڑھ گئے تھے اور ٹیڑھی مانگ کے ساتھ انگریزی طرز کے بال بھی رکھوانے لگا تھا۔ لنگوٹی تو کیا اب تو آترن کے کٹے پھٹے پجامے بھی اتر کر ہاف پینٹ چڑھ گئے تھے اور کھلے گلے کی قمیض جب وہ اپنے پینٹ میں کھونس کر باہر نکلتا تو گھر کے سارے لونڈے جل بھن کر رہ جاتے تھے، ویسے وہ اپنے آپ کو ان کیڑوں سے کہیں بلند سمجھتا تھا۔ خاکی رنگ کی قمیض خاص طور پر اس نے ملٹری والوں کی ریس میں بنوائی تھی، ویسی ہی پٹیاں بھی کندھے پر اس نے درزی سے بڑی تاکید کر کے سلوائی تھیں مگر ایک ہی دو بار پہن کر اس کا جی اس قمیض سے بھر گیا۔ پھر تو اسی قمیض، اپنے جوتوں اور اپنے پینٹ سے بارش کا پانی چھت پر چڑھ کر وہ محفوظ کر لیا کرتا تھا اور جب کسی پر جی جاتا آتے جاتے دیکھ کر اس کی طرف کی نالی کھول دیتا پھر اکیلی چھت پر آکر موں بیٹھا اپنے چھوٹے پیروں کے درمیان اپنا بڑا سا سر گھسیڑے ہی ہی کر کے دیر تک ہنستا رہتا تھا، گھر بھر اس سے پریشان تھا، کتے اور بلیاں تک اس کو دیکھ کر بھاگ جاتی تھیں اور وہ بڑے اطمینان سے اپنا چوڑا چکلا جسم اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر دھرے، بالوں میں عمدہ تیل لگائے اور جاوید کی دراز سے چرایا ہوا سگریٹ منہ میں دبائے بھکابھک دھواں اگلتا، کھانستا، ہی ہی کرتا گھومتا رہتا۔

ذمہ داریوں سے اس کو بڑی چڑھ تھی، ہر آنے والا دن، اور رات ایک ہی طرح

سے گذار دینے میں اس کا جی نہ لگتا تھا، اسی لئے گھر بھر میں اس کو فیض کے کاموں سے بڑی الجھن ہوا کرتی تھی۔ جاوید ہی کے کمرے کے ساتھ ہی لگا ہوا فیض کا کمرہ بھی تھا، مگر سلمتا بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو بچاتا ہوا اس کمرے کے پاس سے گذر جاتا، مگر کبھی تو اس کی باری آہی جاتی تھی، ایک دوبار اپنی پکار سنکر بھی وہ کان دبائے بیٹھا رہتا تھا مگر جہاں فیض کی پکاریں کڑک پیدا ہوتی بیچارہ جھاڑن لیے، یا جوتے کی پالش کی خاطر کسمساتا ہوا حاضر ہو جاتا۔ فیض کے کمرے کا جو دریچہ اندر کی طرف برآمدہ میں کھلتا تھا وہ ہمیشہ بند رہتا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی بس اپنی ضرورت کے وقت ہی کھلا کرتا۔ فیض ایم اے کا اسٹوڈنٹ تھا اور انگلش میں اسکو فرسٹ کلاس تو ضرور ہی لانا تھا۔ جاوید ہی کے دماغ میں بیتر جانے والے گانے اور قہقہوں سے بچاؤ کی بس یہی تو ایک صورت تھی کہ وہ اپنے آپ کو کمرے کے اندر بند کرلے۔ پھر یہ کمبخت سلمتا تو اس گھر کے لئے ایک روگ بن کر رہ گیا تھا، باورچی سے جھک جھک، محلے بھر سے لڑائی، خواہ مخواہ ہر ایک راہ گیر کا منہ چڑانا اور سڑک پر ٹھہرے ہوئے رکشوں کے ٹائر کو پنکچر کرکے مارکٹائی کے شور سے بھی وہ اسی طرح کمرہ بند کرکے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس کے کمرے میں ساری چیزیں بڑے سلیقے سے رہتی تھیں، قیمتی سوٹ ہنگر میں لٹکے رہتے، ساٹن کی چمکیلی ٹائیاں نئیے کے اسٹینڈ پر جھولتی رہتیں، میز پر شیونگ کا سامان، لکھنے پڑھنے کی چیزیں اپنی اپنی جگہ بڑی خوبصورتی سے دھری رہتیں ایک کونے میں ٹیبل فین رکھا رہتا اور سامنے شلف پر ہارڈی کیٹس، شیلی اور شکسپیئر کی کتابوں کا پورا سٹ گہرے نیلے اور سبز گرد پوشوں میں محفوظ سجا ہوا رہتا تھا، وہ اپنے بستر پر اس طرح سے بیٹھا اور لیٹا کرتا تھا کہ کہیں پر شکن نہ پڑ جائے۔ اسی کمرے میں اس کی چمکتی ہوئی سائیکل اور رنگین شیشے کا گلاس بھی رکھا رہتا تھا۔ احاطے کی طرف

کا دریچہ وہ ہمیشہ کھلا رکھتا تھا اور اسی دریچے کے آگے آرام کرسی پر لیٹا پاؤں پھیلائے
بڑے آرام سے سامنے چمکتی ہوئی سڑک اور پیلے رنگ کی خوبصورت کوٹھیوں کو دیکھتا
ہوا وہ پڑھتا رہتا تھا۔ جمی ہوئی گھنی اور سیاہ ابروؤں کے نیچے اس کی کچھ چھوٹی مگر
اتھلی، ذہین اور چمکیلی آنکھیں بڑی تیزی سے گردش کرتی رہتی تھیں، اس کے گورے
خوبصورت چہرے پر ترشے ہوئے شہابی لب بڑے پیارے نظر آتے تھے اور انگلش
کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی طرح ٹیڑھی مانگ کے ساتھ بالوں کی ایک خمیدہ لٹ
ہر وقت اسکی پیشانی پر جھولتی رہتی تھی۔ فیض کو دنیا کے سارے کھیلوں میں ورڈمیکنگ
کے کھیل سے دلی نفرت تھی لیکن گھر کے سارے لوگوں کو بھی ایک ضد تھی کہ
جب تک کسی نہ کسی طرح وہ فیض کو گھسیٹ کر شریک نہ کر لیتے، کبھی نہ کھیلتے تھے
اور فیض کو نہ جانے کیسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ لوگ جان بوجھ کر "لفظ" کو اسی پر
توڑ دیتے ہیں۔ کھیل کے شروع ہوتے ہی اس کے چہرے پر ایسی پریشانی چھا جاتی جس
کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی تھی، اور اپنی اسی گھبراہٹ کو چھپانے کیلئے بار بار وہ
سیٹی بجانے لگتا تھا۔ "ورڈمیکنگ" کا نام آتے ہی سب کی نظریں فیض پر جم
جاتیں، جاویدی کا طویل قہقہہ بلند ہوتا اور شاہد دبی مسکراہٹ کے ساتھ فیض
کو ہمدردانہ مشورے دینے لگتا تھا۔ فیض کو ایسی بے بسی کی حالت میں دیکھتے ہوئے
سلمتا کو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ جاویدی کے قہقہوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی زور زور سے
تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگتا، اور فیض اپنا سارا غصہ اسی پر اتارا کرتا تھا۔ "ایڈمیٹ۔۔۔
نونسنس" اور اس کے ساتھ کان پکڑ کر سو دفعہ کی اٹھا بیٹھی، جب تک سلمتا تھک کر
ہانپنے نہ لگتا وہ اسی طرح سے اٹھک بیٹھک کرتا رہتا تھا مگر فیض کو ان سزاؤں کی قیمت بڑی
مہنگی پڑتی تھی۔ اسی دن چلتے چلتے اس کی سائیکل ضرور خراب ہوا کرتی تھی۔ کبھی چکر
نکل پڑتا تھا، کبھی ٹائر پنکچر ہو جاتا اور کبھی بریک ہی کام نہ کرتے تھے اور جاویدی جیسے پہلے

ہی سے فیض کے ساتھ ہونے والی حادثے کا منتظر رہتا تھا۔ قیمتی سوٹ کے عمدہ کریز کو سنبھالے جب بچارہ فیض اپنی سائیکل کو گھسیٹتا ہوا نظر آتا تو جاوید ہی سامنے اپنے کمرے میں بیٹھا تکیہ میں منہ کو چھپائے ہنستا رہتا تھا۔ سلمتا کی طرح جاویدی کو بھی فیض کے سلیقے، قاعدے قانون سے بڑی چڑھ تھی ــــ بھئی۔ دنیا میں کب کسی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی ہے؟ پھر بچارہ جاویدی اگر کسی اچھے رنگ کی ٹائی، کوئی اچھا سا ناول یا جوتے کے لئے فیتہ، ذرا دیر کے لئے فیض کے کمرے سے اڑا لینا چاہتا تھا تو اس میں کونسی قیامت آجاتی۔ بند کمرے میں ٹیبل فین بند پڑا رہتا اور ادھر جاویدی کی ساری قمیض پسینے سے شرابور رہتی۔ فیض کے کمرے میں لگے ہوئے ماسٹر تالے کو جاویدی اور سلمتا دونوں مل کر کس کس ترکیب سے کھولنے کی کوشش نہیں کرتے تھے مگر واہ رے تالا ــــ جو اپنی جگہ سے کبھی ٹس سے مس ہوتا۔ جاویدی فیض کی اس محدود دنیا سے نالاں تھا۔ ایک اس کی اپنی شخصیت تھی وسیع اور ہمہ گیر، گھر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پر جاویدی کی چیزیں پڑی نہ ملتی ہوں۔ اس کا بڑا عزیز صابن وہائٹ روز جو دو ایک روز تو بڑے احتیاط سے دراز کے اندر رہتا، پھر کھلی چھت والے غسل خانہ میں ایسے ہی پڑا چولتا رہتا تھا۔ اس کا جوتا، چپل، لنگی اور تولیہ گھر کے مختلف حصوں میں پڑے رہتے تھے۔ اس کا کنگھا کبھی تو سلمتا کی کوٹھری میں پایا جاتا اور کبھی باورچی خانے کے ریک کے اوپر۔ اس کا سوٹ کیس زیادہ تر خالی ہی پڑا رہتا تھا۔ کپڑے یا تو دھوبی کے یہاں رہتے تھے یا پھر میز کے اوپر، شلف کے نیچے، کھونٹی کے اوپر یا کواڑوں پر جھولتے نظر آتے تھے، شاہد کا صندوق جاویدی کے لئے کپڑے مہیا کرتا رہتا، دن بھر کالج جانے سے پہلے اور کالج سے واپس آکر اس کا یہی ایک خاص کام رہتا تھا کہ سلمتا کو دھوبی کے گھر دوڑاتا رہے۔ پینٹ کی کریز کوٹ پر استری، اور جوتوں پر پالش کا اسکو بڑا خیال رہتا تھا۔ جاوید کا کمرہ کاہے کو

تھا۔ اچھا خاصہ کباڑ خانہ تھا اور ایک طرح سے بھول بھلیاں بھی۔ اسکائی لائٹ سے میلا کپڑا اتارنے کیلئے اس کے پلنگ پر بڑے مزے میں کرسی دھری رہتی تھی، کھلا ہوا سوٹ کیس بھی زیادہ تر اس کے بستر پر ہی رکھا رہتا۔ میز بیچاری خالی پڑی رہتی اور اس کے میز پوش سے دریچہ کے شیشے سے چھنتی ہوئی دھوپ روکی جاتی تھی جس دن جوتوں پر پالش کی جاتی اس دن سارے جوتے میز کے اوپر ہی رکھے جاتے تھے، کتابوں کے لئے بھلا جگہ کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ کبھی سوٹ کیس میں دبکی نظر آتیں اور کرسیوں پر بڑے ٹھاٹ سے پڑی رہتیں۔ دریچے کے آگے والے ریک کو جاوید نے ایک طرح سے اپنی میز ہی بنا لی تھی۔ مڑی تڑی، لٹکی پھٹکی جلدوں والی کتابیں ہر بار دریچہ کھلنے اور بند ہونے پر بھد بھد کر کے نیچے گرتی رہتی تھیں۔ جاوید کا بستر بھی اچھے حال میں نہ رہا۔ لحاف، کمبل اور دلائی، ہمیشہ ایک دوسرے سے گتھے رہتے تھے اور اسی ڈھیر کے اوپر اور نیچے اتاری ہوئی پینٹ، صاف دھلی ہوئی قمیص، کھونٹی پر سے گرے ہوئے بہت سے کپڑے، چند کتابیں، چائے کی جھوٹی پیالی اور سلیپنگ سوٹ، سبھی ایک دوسرے سے گلے ملے پڑے رہتے تھے مختلف سائز اور ڈیزائنوں کے بنے ہوئے رنگ برنگے چپل اور سینڈل اوندھے سیدھے کمرے میں ہر طرف پڑے رہتے تھے۔ جاگتے ہوئے جاوید کا پیر ہمیشہ سویا رہتا تھا، اسی لئے وہ قرینے سے صرف اپنی ہی چپل کبھی نہ پہن سکتا تھا، اور اس کو اتنی بھی خبر نہ رہتی تھی کہ اس وقت وہ شاہد کی چپل پہنے ہے یا انور کی، ہر بار وہ اپنے کمرے سے ننگے پیر نکلتا اور واپس جاتے ہوئے اس کے پیر میں کسی نہ کسی کے جوتے یا چپل ضرور ہوتے اور اس طرح سے اس کے کمرے میں جوتوں اور چپلوں کی ایک دوکان سی لگ جاتی تھی، کبھی کبھی جاوید کچھ اتنے اہتمام سے اپنی مسہری کا پردہ لگایا کرتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے، گنگا کے کنارے جہاں کہنے کو

تو لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ بڑی اچھی ہوا ملتی ہے اور صحت کیلئے بڑی اچھی جگہ ہوتی ہے۔
وہاں صحت کی خاطر مچھروں کی فوج کو خونِ جگر بھی تو پلانا پڑتا تھا۔ شام ہوتے
ہی مچھروں کی خوفناک یورش شروع ہو جاتی۔ اگر کہیں بھولے بھٹکے جاویدی جلدی گھر
آجاتا اور بیکاری سے تھک کر کورس کی کتاب ہاتھ میں اٹھا لیتا تو پھر سیکڑوں مچھر
اس کے جسم سے چمٹ جاتے تھے۔ بچارہ جاویدی بوکھلا کر مسہری کا پردہ اٹھا کر لے آتا
بانس رہے نہ رہے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ایک آدھ بانس اِدھر اُدھر کھونس کھانس کر دریچے
کے جنگلوں اور کواڑ کی چٹخنی تک مسہری کا پردا باندھنے کو لمبی ڈوری کی ضرورت جو پڑتی
تو کبھی کبھی جاویدی اسکو کپڑا ٹانگنے کے ہینگر، میلے میلے موزوں، جوتوں سمیت فیتوں
اور پجامے کے ساتھ ازاربندوں سے لگاتار جوڑ جاڑ کر پورا کر ہی لیا کرتا تھا، اتنی ساری
بے ہنگم چیزیں جالے کی طرح جھولتی رہتیں اور وہ اپنے پردے کے اندر روشنی
کے سامنے کتاب کھولے بڑے مزے میں لہک لہک کر گاتا، گا گا کر پڑھتا اور پڑھتے
پڑھتے سو جاتا تھا۔ جاویدی کو اپنے بالوں کی لہریں بڑی عزیز تھیں اور اس کے سانولے
نمکین چہرے پر بڑی بڑی ذہین آنکھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کو اپنے ڈیل ڈول
اور جسم کی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا۔ سوٹ پہن کر بوڈر لگائے ٹائی باندھنے کے بہانے
وہ اپنی پرسنیلٹی کا جائزہ لیا کرتا تھا اور جب وہ اپنی طرف سے کافی مطمئن ہو جاتا، تب
بڑے ٹھاٹ سے گھر والوں کو ایک لمبا سلام کر کے سیدھا بلیرڈ کھیلنے چلا جاتا تھا
وہ ینگ مین انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری تھا اور گھر والوں کو اس بات کا یقین دلانے کے
لئے اپنے نام کا چھپا ہوا پیڈ اور فارم لا لا کر دکھاتا رہتا تھا، پھر بھی گھر والے اس کی اتنی
بڑی شخصیت کا اقرار کرتے ہی نہ تھے۔ جاویدی ہمیشہ دن کی روشنی میں کھلے ہوئے
دروازے سے جایا کرتا تھا مگر اس کی واپسی کے راستے بڑے عجیب عجیب تھے۔
دو، دو بجے رات کو دیوار پھاند کر، کبھی آنگن میں آم کے درخت پر چڑھ کر چوروں کی طرح

اندر آیا کرتا تھا اور کبھی سلمتا کو دیوار پر سے لڑھکا کر دروازہ کھولنے کو بھیجتا۔ رات کے سناٹے میں سڑک پر سوئے ہوئے کتے جب زور زور سے بھونکنے لگتے تھے تو یہ جاویدی کے آنے کا نشان سمجھا جاتا تھا، پھر بھی شاہد کا خیال تھا کہ جاویدی میں "بڑے آدمی" بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ ضرور "بڑا آدمی" بن کر رہے گا۔

یہاں پر یونیورسٹی کے بہت سے چھوٹے بڑے کوارٹرز اور کوٹھیاں تھیں جن میں سینیئر اور جونیئر کے حساب سے پروفیسر رہتے آ رہے تھے۔ مگر اب ان کوٹھیوں میں کچھ فوجی آفیسر بھی آ گئے تھے۔ تھوڑے دنوں سے سامنے کی دو منزلہ کوٹھی میں شلواروں کی چمک آ گئی تھی، اور گرجدار باتوں کی آوازیں جاویدی کے کمرے سے قریب گونجنے لگی تھیں۔ اوپری منزل کی لمبی دریچی کے پاس سے کبھی کبھی ایک اچھی سی مسکراتی ہوئی صورت بھی نظر آ جاتی۔ دو چار دنوں تک تو جاویدی اکیلا ہی چپکے چپکے سامنے والے دریچہ کو دیکھتا رہا تھا پھر اس سے خاموش نہ رہا گیا۔ اور ایک دن فیض کو پکڑ کر اس نے وہ لمبی دریچی آخر دکھلا ہی دی۔ ہنستا ہوا چہرہ، گل مُہر کی لدی ہوئی شاخوں سے تھوڑا اوٹ میں رہ جاتا تھا، اور اتنے اچھے چہرے پر گل مُہر کا یہ گھونگھٹ بھلا وہ کیسے برداشت کر لیتے آخر ایک دن جاویدی اور فیض اپنی اپنی کتابیں لئے باہر برامدے میں پڑھ رہے تھے اور سلمتا بندروں کی طرح اچھلتا کودتا کلھاڑی لئے گل مُہر کی شاخوں کو کاٹتا جا رہا تھا۔ پھولوں سے بھری ہوئی شاخیں کٹ کٹ کر نیچے ڈھیر لگ گئیں، سامنے کی کوٹھی اب صاف طور پر نظر آنے لگی تھی۔ دریچے کے پیچھے کی مسکراہٹیں بڑھتی گئیں اور دور سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُٹھا کر پرنام کرنے لگے تھے۔ جاویدی نے جہاں آج تک اپنے بی۔ اے کے بکھڑوں کی پرواہ ہی نہ کی تھی دہاں وہ بیچارہ اتنی دور کے سلاموں کا بوجھ کب تک اٹھا سکتا تھا، وہ تو جلد ہی اکتا کر پھر اپنے پرانے راستے پر لگ گیا۔ مگر غریب

نسیں کی مستقل مزاجی سے اس کی کئی کتابیں ادھوری پڑی رہ گئی تھیں اور وہ گہری دلچسپی کے ساتھ اپنا کمرہ بند کیے، کتاب کھولے اسی ایک لمبی دریچی کو تکتا رہتا تھا کبھی کبھی غیر ارادی طور پر شاہد کی نگاہیں بھی اُس دریچی کی طرف اٹھ جاتیں اور فیض کی محویت کو دیکھکر ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل جاتی تھی۔ وہ جاویدی، فیض اور سارے لڑکوں سے بڑا تھا۔ مگر بے حد دلچسپ، سارے کھیلوں میں حصہ لینے والا، کبھی کبھی دیکھنے میں وہ ایک جھیل کی طرح پرسکون لگتا تھا۔ اس کا دل شیشے کی طرح صاف تھا اور دنیا کی ساری باتوں کا اچھا ہی پہلو اس کے پیش نظر رہتا تھا۔ اسی لیے جاویدی کا خیال تھا کہ سینٹ زیویر چرچ میں فادر موران کی جگہ شاہد زیادہ اچھا رہتا۔ سچ مچ، شاہد کی محبت بھری آواز میں بکھری ہوئی بھیڑوں کو جمع کر لینے کی بڑی اچھی صلاحیت تھی شاہد اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دے رہا تھا اور بدقسمتی سے اس کو دنیا کا کوئی شعر کبھی یاد نہ رہتا تھا۔ قدیم دکنی شاعروں کے سارے نام یاد رکھنے کے لیے اس نے جاویدی فیض، انور، شمی، تاج اور گھر کے سارے نوکروں کے وہی نام رکھ لیے تھے۔ نہ جانے اس کو اقبال کا ایک شعر کیوں اتنا پسند تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے امتحان کے پرچے میں وہ اس شعر کو لکھنے کے لیے بے چین تھا،

"کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو"

مگر بچارے کو اپنے حافظے پر اعتبار نہ تھا۔ بڑی مشکلوں سے رٹ رٹا کر یہ ایک شعر اس نے یاد تو کر لیا تھا مگر شعر کے معنی سے ملتی جلتی جب تک کوئی حرکت اس کو یاد نہ آجاتی اس کو شعر یاد نہ آتا تھا۔ اسی لیے جاویدی کے سپرد یہ خدمت تھی کہ شاہد جب بھی یہ شعر پڑھے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگا کر ہلا جائے اور اس طرح شاہد کے ذہن میں وہ شعر ابھر سکتا تھا۔ شاہد کو دنیا میں بس دو چیزیں عزیز تھیں، ایک تو سگریٹ اور دوسری چائے۔ شاہد کو فیض کے کمرے میں جگہ ملی تھی جہاں فیض کے ساتھ اس کو بھی گھنٹوں بند رہنا پڑتا تھا۔

یہاں یونیورسٹی کے کوارٹروں اور کوٹھیوں کی وجہ سے سڑک بھی گویا
پرائیوٹ ہی تھی۔ سارا دن ہر طرف ایک مہذب خاموشی چھائی رہتی۔ سُرخ
سنہرے اور سفید رنگ کے پھول بھی بڑے ہی پرسکون طور پر آہستہ آہستہ ڈولتے
رہتے تھے۔ ایسی تنہائی میں جب کہ سب کے سب کالج چلے جاتے، سلمتا اپنی
پائی ہوئی سزاؤں کا بدلہ لیا کرتا تھا۔ شمی کا جوتا بلیڈ سے چیر دیتا، جاویدی کی
ٹائی اس کا کمر بند بن جاتی، اور فیض کی دریچی میں پانس ڈال کر چیزوں کو الٹ
پلٹ دیتا۔ بہت دنوں سے اس کو فیض کا ایک لال قلم بڑا اچھا لگتا تھا' اور
اس قلم کو دیکھتے ہی بے اختیار اس کا جی چاہنے لگتا تھا کہ ذرا اس سے کوئی نشان
تو بنا کر دیکھے کہ آخر وہ کیسے آپ ہی آپ چلتا چلا جاتا ہے؟ مگر اس کو فیض
کی اس "نونسنس" اور "ایڈمیٹ" کی آواز سے بڑی چڑھ تھی۔ "اُہنہ" ایڈیٹ
— نونسنس" بھلا یہ بھی کوئی بات تھی' نہ جانے ماں کی گالی دیتے ہیں یا باپ
کی، سالہ نوکری کے پیچھے اپنی اجت بھی کھراب ہوتی رہتی ہے"۔ اور آخر،
ایک دن موقعہ پا کر اس نے اپنی آرزو پوری کر ہی لی تھی، فیض کے کالج جانے
سے پہلے ہی اس نے دراز میں سے لال قلم نکال کر، میلے کپڑے کی الماری میں چھپا دیا
تھا۔ اور سارا دن اکیلا بیٹھا وہ اس سے طرح طرح کے نشان بناتا رہا تھا، قلم بڑے
مزے میں سرسر چلا جا رہا تھا اور سیاہی کی دھاریاں خود سے بنتی چلی جا رہی تھیں۔
قلم اس کو بے حد اچھا لگا۔ مگر ہائے رے مجبوری۔ کہ وہ اس کو اپنے پاس رکھ بھی
نہ سکتا تھا۔ اور یہ فیض کی شرارت ہی تھی نہ کہ بچارہ سلمتا گھر کا اتنا کام کرنے کے
بعد بھی اپنی پسند کی کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا' اور اسی غصہ میں اس
بار کر "فونٹن پن" کو گلی کے ایک لونڈے کے ہاتھ اس نے پانچ پیسے میں بیچ دیا تھا۔
ایک اکنی اور گول سوراخ والا چمکتا ہوا پیسہ لیے وہ جب اپنے احاطے میں سست

سست قدم اٹھاتا ہوا واپس آیا تو اس کو قلم بیچ دینے کا بڑا دکھ ہو رہا تھا مگر اس کو یہ تسکین تو تھی کہ چلو ! اب میاں فیض بھی اس سے محروم ہو گئے ہیں۔

یہ کوارٹر سب سے الگ اک کنارے گنگا کے قریب تھا، اور گنگا کے اسی کنارے شہر کا سب سے بڑا شمشان تھا، اسی لیے جب بھی پروا ہوا چلتی، جلتی ہوئی گوشت کی بدبو دماغ کو خراب کر دیتی تھی۔ کبھی کبھی ہلکا ہلکا دھواں بھی گھر میں آجاتا تھا۔ جہاں کہیں "رام نام ستّ ہے" کی آواز کے ساتھ باجے، ڈھول کی آواز آتی، سلمتا سارے کام دھام چھوڑ چھاڑ کر تیر کی طرح جاتا، ارتھی کے آگے پیچھے "ہی ہی" کرتا دانت نکالے پیسہ لوٹنے والوں میں سب سے آگے رہتا اور جب اس کے ہاتھ میں کافی پیسے آجاتے تو پھر زور سے ہاتھ گھما کر ان سارے پیسوں کو دریا میں پھینک کر جلتی ہوئی لاش سے دور بیٹھا ہوا کہتا "یار ! پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے دریا میں ڈال دئے ہیں لے لینا" ایسا کرنے میں اس کو بڑا مزہ ملتا تھا۔ ہر وقت اس کی روح میں بیٹھا کوئی گدگدی کیا کرتا تھا۔ وہ مٹی کے تیل کی ایک ایک بوتل پی لیا کرتا تھا مگر اس کو کبھی کچھ بھی نہیں ہوتا، اپنے گالوں پر اپنے زور زور سے تھپڑ مارا کرتا کہ سننے والوں کے کان بھنجھنا جاتے تھے مگر وہ اسی طرح ہنستا اور اچکتا پھرتا تھا۔ اپنا تماشا دکھاتے ہوئے اسے بڑی مسرت ہوا کرتی تھی۔

گنگا کے کنارے کی وجہ سے شام ہوتے ہی مچھروں کے دل کے بادل اسطرح حملہ آور ہو جایا کرتے تھے کہ بس اللہ کی پناہ۔ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے موٹے موٹے سیاہ مچھر شام سے لیکر صبح تک دل و دماغ میں اپنی بھنبھناہٹوں سے ایک قیامت اٹھائے رہتے تھے۔ اتنا وقت جیسے دوزخ میں گزرتا تھا۔ سلمتا کے ذمہ گھر بھر کا مسہری کا پردا لگانا رہتا۔ پردوں کا ایک بوجھا لیے وہ بڑی پھرتی سے اپنا کام کر لیتا تھا۔ اس کو پردہ لگانے میں بڑی مہارت ہو گئی تھی، کہیں کیل ٹھونک کر، کسی جگہ رسّی یا ڈوری باندھ بوندھ کر وہ پردے لگا ہی دیتا تھا۔ اندر پردا لگاتے لگاتے وہ اکثر بڑبڑاتا "بھلا کا جنے کیسے کاٹے ہے سکو مچھر، ہم کو تو کبھی نہیں کاٹتا" اور اکیلے

میں وہ آپ ہی آپ ہنس دیتا۔ "سب میرے دوست ہیں جی۔" اللہ کرے تاج بابو کو کھوب مچھر کاٹے۔ باپ رے باپ، سب سے بڑا مچھر تو وہی ہیں۔" اور تاج سچ مچ بڑے بڑے ڈنکوں والا ایک مچھر ہی تو تھا، گھر بھر میں سب سے چھوٹا، دبلا پتلا پیلے رنگوں والا تاج، دیکھنے میں معصوم سا، دبی دبی ہنسی ہنسنے والا، مگر پکا شیطان۔ سلمتا دنیا میں بس اسی سے ذرا ڈرا کرتا تھا۔ سلمتا، تاج کے ڈر سے چھپ چھپ کر سوتا مگر تاج اس کو ڈھونڈھ ہی لیا کرتا تھا اور بیچارے سلمتا کے انگریزی تراش کے بال جگہ جگہ قینچی سے کاٹ دیتا۔ وہ غریب سویا رہتا اور تاج سلمتا کے کان اور ناک میں جھاڑو کا تنکا دے کر گدگدی کرتا رہتا تھا۔ تاج کو باورچن سے بھی دلی نفرت تھی۔ جب بھی تاج باورچی خانہ میں جاتا، باورچی کو جگہ کی تنگی کی شکایت ہونے لگتی تھی، اسی لیے وہ اس کو چڑھا چڑھا کر چولھے کی آگ میں تھوکتا اور طرح طرح سے اس کو ستایا کرتا تھا۔ اس کو باورچی کے بیٹے مقبول سے خواہ مخواہ کی ضد تھی، کالے کلوٹے چھوٹے سے چھوکرے کو دیکھتے ہی تاج کے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ نازوں کا پالا ہوا یہ لونڈا اپنے باپ کی آنکھوں کا تارہ تھا، جب دیکھو بَوا بنا پھر رہا ہے اور اسی چہیتے پن سے تاج کو عداوت تھی۔ روز دو پیسے کی گڑ کی مٹھائی تاج اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا اور پھر وہ اس کے سر کے بال نوچتا رہتا تھا ـــــ ٹائیفائڈ کے مریضوں کی طرح اس کی چاند صاف ہو گئی تھی۔ باپ کی نظر جب بھی اس کے سر پر جاتی وہ بے اختیار اپنے بچے کو سینے سے لپٹا کر رو پڑتا۔ "ہائے میرے لال، کس کی نظر کھائے جا رہی ہے بیٹا؟ ذرا دیکھو تو یہ میرے بچے کے سر پر سے بال تک جھڑتے چلے جا رہے ہیں۔" اور تاج بڑی خاموشی سے منہ لٹکائے معصوم بنا بیٹھا سنتا رہتا تھا۔ تاج کی گھر بھر میں اگر کسی سے دوستی تھی تو شمی سے تھی۔ شمی میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ تھا، درمیانے قد کا خوبصورت نفاست پسند بڑی خاموش طبیعت کا، بڑی سنجیدہ ہنسی ہنسنے والا، پڑھنے میں بڑا محنتی تھا۔ وہ گھر کے سارے ہنگاموں قہقہوں، لگانوں سلمتا اور تاج

کی شرارتوں میں، دور ہی دور سے دلچسپی لیا کرتا تھا۔ کبھی فیض کو بنانے میں جاویدی کا ساتھ دیتا تھا اور کبھی فیض کا۔ اس کو تاج سے اس لیے ہمدردی تھی کہ تاج سب سے چھوٹا اور سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس کا کمرہ کاہے کو تھا بس ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، مگر وہ اس کو بڑا سجا کر رکھتا تھا۔ اس کی میز کے اوپر انسانی ہڈیاں بکھری پڑی رہتی تھیں اور وہ دو دو بجے رات تک پڑھتا رہتا تھا۔ تاج کو شمی سے بڑی بد دلی تھی ایک تو میڑک میں حساب کی ایسی ہی بھرمار ہوتی تھی، دوسرے رات کے سناٹے میں "رام نام ست ہے" یا "ہری بول" کی خوفناک آوازیں جہاں سنائی دیتیں اس وقت اپنا بستر چھوڑ چھاڑ تاج شمی کے بستر میں گھس پڑتا تھا۔

اس کوارٹر کے اندر انور کے دھیمے دھیمے نغمے تیرتے رہتے تھے۔ ہر بار اس کے لبوں پر نغموں کی ایک طویل کراہ رہتی تھی ــ" کاش ایسا ہو کبھی"، شاید یہی اس کی اپنی روح کی پکار بھی تھی۔ اڑا اڑا سا چہرہ، نشے میں ڈوبی مخمور سی بڑی بڑی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ اس کے بال بڑے خوبصورت تھے۔ ٹیڑھے گلے میں کرتے کا بٹن ہمیشہ کھلا رکھتا تھا۔ اس کو میراجی۔ ن۔ م۔ راشد اور سلام کی نظمیں بہت پسند تھیں اور اسی احساس پسندگی نے اس کو شاعر بنا دیا تھا۔ اس نے کئی اردو نظمیں لکھی تھیں جن میں بس جالے ہی جالے رہتے تھے، زندگی کے جالے، خیالات کے جالے، محبت اور تصور کے جالے۔ شاید یہ لفظ اس نے جاویدی کے لگائے ہوئے پردے کے ان عجیب و غریب جالوں ہی سے سیکھا ہو گا جو اس کے کمرے اور خود اس پر بھی چھا جاتے تھے، انور بیچارہ بدقسمتی سے جاویدی کے کمرے کا ساتھی تھا۔ انجینیرنگ کے حسابوں کے ساتھ ساتھ جاویدی کے قہقہوں سے بھی اسکو نبٹنا پڑتا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جس میں ایک بڑا کمرہ، تین چھوٹے کمرے اور بہت ہی چھوٹے برآمدے تھے۔ اس میں اتنے لوگ، اور اس پر سے ہجوم در ہجوم

مچھروں کے دَل کے دَل ــــ شام ہوتے ہی ایک ہی ساتھ سارے مچھر بھنبھناتے ہوئے شور مچانے لگتے تھے۔ مچھر جسم و جان سے ایسے چمٹ جاتے تھے کہ سانس لینے اور بولنے میں بھی منہ ناک میں گھُسے چلے آتے تھے۔ گھر کے اندر ہر ایک کمرے سے پڑھنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہتیں۔ انور کی طویل آہ "کاش ایسا بھی ہو کبھی" رہ رہ کر سنائی دیتی اور پھیلے ہوئے رات کے اندھیرے میں فیض اپنا یہ مخصوص گانا گایا کرتا۔

نغموں کا نشیب و فراز اور آخری لَے کی بل کھاتی ہوئی تھرتھراہٹ کی ٹوٹتی ہوئی گونج رات کے آنچل میں دھیرے دھیرے سمٹتی چلی جاتی تھی۔ اسی وقت سلمتا کا خاص کام تھا کہ گندھک اور دھونی کا دھواں گھر میں کر دے اور میکوآئل کے پچھتے ہر کمرے میں جلا دے تاکہ کچھ تو مچھروں سے نجات ملے۔

اتنے ہنگاموں میں ہر اک سے الگ تھلگ بچارہ ادیب و پروفیسر اپنے بڑے کمرے میں سب سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا، پھر بھی وہ اس طوفان کی زد سے باہر نہ رہتا تھا۔ کالج سے واپس آ کر جوتا اُتارنے پر کبھی اس کا اپنا چپل نہ ملتا، اس کی لنگی، تولیہ اور کنگھی اکثر گھر کے مختلف حصوں میں پھیلے رہتے تھے، اس کا اچھا بنا یا ہوا تب دالاقلم تو زیادہ تر میز پر سے غائب ہی رہتا تھا۔ پروفیسر نے اپنے رشتہ دار طالب علموں سے الگ تھلگ رہنے ہی میں بہتری سمجھی تھی۔ قریب کے دوسرے پروفیسر بڑی حیرت سے پوچھا کرتے تھے کہ اس نے اپنے اتنے چھوٹے سے کوارٹر کو کیسے پھیلا رکھا ہے؟ وہ صرف ہنس دیا کرتا تھا، گھر چھوٹا تھا تو کیا؟ اس کے قلب و نظر میں تو وسعت تھی نا! دن بھر اس کو ذرا بھی فرصت نہ ملتی تھی، کالج لائبریری اور سنٹ جان ایمبولنس کے کام تھکا کر چور کر دیتے تھے، اگرچہ راتیں اسکی اپنی تھیں

مگر بے بس۔ وہ کھلے ہوئے دریچے کے پاس میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا سادہ کاغذ لیے افسانہ لکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کی تھکی ہوئی نگاہیں کبھی کبھی اپنے سامنے رکھی فیروزی رنگ کی جلد والی سفید موٹی سی کاپی پر جاتیں تو وہ اور بھی دل شکستہ ہو جاتا اسی کاپی میں وہ اپنا شاہکار ناول لکھنا چاہتا تھا، مگر اب تک تین باب سے زیادہ لکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ قلم روشنائی اور لکھنے پڑھنے کا سارا سامان اس کے سامنے پڑا رہتا مگر افسانے اور ناول کے پلاٹ کی جگہ اس کو سینیٹ کی میٹنگ اور یونینوں کے الجھاوے یاد آجاتے تھے۔ وہ اپنی کھوکھلی نگاہوں سے اس دریچے کے باہر اندھیرے کو تکتا رہتا اور بجلی کی تیز روشنی میں بیشمار مچھر اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ مچھروں کی تیز بھنبھناہٹ اس کے جسم سے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ مگر وہ اس آواز سے بہت دور نہ جانے کہاں کھویا رہتا تھا اسی لیے جاویدی کا خیال تھا کہ پروفیسر اب بہت ڈل ہوتے جا رہے ہیں۔ فیض کے ادھ کھلے دریچے سے کبھی کبھی انگریزی گانوں کی بھٹکتی ہوئی تھرتھراہٹ آتی رہتی۔ شمی ڈاکٹری کی کتابیں زور زور سے پڑھتا رہتا اور رہ رہ کر شاہد کی آواز بھی سنائی دیتی تھی بکری پانی پلا اور نصرتی کے ہاتھ سے چائے بھیجو۔ مچھروں کی تیز گردش اس کے قریب ہی اپنا وحشیانہ رقص جاری رکھتی۔ مسلسل بھنبھناہٹیں اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو جاتیں اور ہجوم در ہجوم مچھروں کے ڈنکوں سے اس کے جسم کے ساتھ روح بھی چھلنی نظر آتی اور وہ تھکا ہوا سا مایوس، بے بس اپنا قلم رکھ کر سوچا کرتا کہ وہ پبلشروں اور ایڈیٹروں کو اب کیا لکھے گا؟ یہی جاویدی کے فلمی گانے شیلی اور کیٹس کے نغموں کی آخری تھرتھراہٹ علم الاعضا کا تتو کی سبق نصرتی کی پکار یا مچھروں کے ڈنک؟

کبھی کبھی سلمتا کے دل میں بیزاری کا ایک اُبال بھی اٹھا کرتا تھا اور تب اس کا جی چاہتا تھا کہ اس احاطے کی دیوار سے کود کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے بھاگ جائے

پردے لگانے کے اتنے بوجھ اور گو نجائے ہوئے دھوئیں میں اس کی وحشی روح بھی پھڑ پھڑانے لگتی ہے، مگر یہ سارے ہنگامے جیسے اب اس کے اپنے ہو چکے تھے۔ کمروں میں سے آتی ہوئی اتنی ملی جلی ہوئی آوازوں کو اس کے دل و دماغ اپنا چکے تھے اور جنگی بمبار جہازوں کی طرح اتنے مچھروں سے اس کو ایک لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ کسی طرح سے بھی یہاں سے جا نہ سکتا تھا۔ ایسا گلزار گھر اس کو ملتا بھی کہاں؟ پھر یہ ہر روز جاویدی کے لہکتے ہوئے گانے کہاں سے نصیب ہوتے جاویدی کے گیت، جاویدی کا کمرہ اور اس کی ساری چیزیں سلمتا کی اپنی تھیں اور وہ اتنی ساری چیزوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا تھا؟

دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، سلمتا اپنے کاموں سے فرصت پاکر باہر برآمدے میں بیٹھا دیواروں سے چپٹے ہوئے مچھروں کو تھپ تھپ، مارتا جا رہا تھا۔ آج وہ کسی خاص موڈ میں نہیں تھا۔ اسے لیے اپنی بیکاری اسے کھل رہی تھی۔ وہ بڑا تھکا ہوا تھا۔ "گلی ڈنڈا" کھیلتے کھیلتے اس کے ہاتھ لال ہو گئے تھے اس کے بعد کئی لونڈوں کی دیکھا دیکھی مرگھٹے کی راکھ میں وہ بھی سونا ڈھونڈتا رہا تھا۔ ہندو سہاگنیں سونا پہنا کر جلائی جاتی تھیں۔ وہاں سے نکل کر کوئلہ ڈھونے والے ٹھیلے کے پیچھے پیچھے جا کر چپکے سے کوئلہ روکنے والے تختے کی کیل کھینچ لی تھی۔ ٹھیلے والا بچارہ بے خبر آگے آگے جا رہا تھا کہ یکایک سارا کوئلہ ھڑ ھڑا کر بیچ سڑک پر ڈھیر لگ گیا تھا، اور سلمتا خوشی کے مارے تالیاں بجاتا، کھلکھلاتا گھر کے اندر گھس پڑا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس کا جی سینما دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر ہائے رے۔ گھر کے اتنے کام اس کو پیسے ڈالتے تھے اور وہ کئی طرح کی باتیں سوچتے سوچتے اسی دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا جب اس کی نیند ٹوٹی تو ہر طرف خاصہ اندھیرا چھا رہا تھا، سارے لوگ سو چکے تھے، اس کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

اس نے اٹھ کر اپنا کھانا تلاش کیا مگر غصیلے باورچی کو آج اسے بھوکا رکھنے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ وہ دوپہر سے بھوکا تھا، اسی لیے اس کے پیٹ میں ایک اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ یک بیک اس کو یاد آیا کہ جاویدی کی میز پر اس کا کھانا رکھا ہوا ہوگا۔ انور یا نو بھی گھر گئے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا جاویدی کے کمرے میں چلا آیا، روشنی جلائی اور بڑے اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ کئی بار جاویدی کا کھانا بلی کھا چکی تھی، پھر آج بھی وہ بلی کا نام لگا دے گا۔ سردی کی وجہ سے مچھروں کی بڑی زیادتی ہو گئی تھی۔ کالے کالے مچھروں کے جھنڈ مسہری کے پردوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ زندگی میں آج پہلی بار سلمتا کا جی انہیں دیکھ کر لرز اٹھا۔ کمرے میں اڑتے ہوئے مچھر اس کے سارے جسم سے چمٹے جا رہے تھے۔ آج پہلی بار اسے اپنی موٹی کھال پر مچھروں کے ڈنک محسوس ہو رہے تھے اور وہ تلملا تلملا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مچھروں کو ہنکار رہا تھا۔ جاویدی کا بستر بڑا صاف ستھرا جھلک رہا تھا، مچھردانی لگی ہوئی تھی ـــــ نرم نرم سفید پردہ ہر طرف سے دبا ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سلمتا کو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ساری چیزیں اس کو اپنی طرف پکار رہی ہیں۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوتی جا رہی تھیں وہ کھڑے کھڑے اونگھنے لگا تھا، مگر یہ کمبخت مچھر اس کو سونے ہی کب دیتے تھے اور جیسے ہی اس کی آنکھ ذرا سی کھلتی سامنے جاویدی کا بستر اس کو پکارنے لگتا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا، اس نے سوچا جاویدی جب کیواڑ کھولنے کو پکارے گا تو وہ بستر سے اٹھ کر چلا جائے گا۔ بھلا جاویدی کو پتہ بھی کیسے چلے گا کہ اس کے بستر پر کون سویا تھا۔ اور سلمتا بڑے آرام سے جاویدی کے بستر پر تکیہ لگا کر سو گیا۔ ـــ جاویدی کی مسلسل پکاریں اس کو جگا نہ سکیں۔ مشکل سے شاہد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ جلتی ہوئی روشنی میں سامنے میز پر برتن

خالی پڑے تھے۔ بھنّایا ہوا جاویدی جیسے ہی پردہ اٹھا کر سونے کے لیے آگے بڑھا اس کی نظر اپنے بستر پر سوئے ہوئے سلمتا پر پڑی۔۔۔ وہ بے خبر سو رہا تھا اس کے میلے میلے بالوں سے تکیہ کا غلاف گندہ ہو چکا تھا، اور اس کے کھلے ہوئے مونہہ سے بہتی ہوئی رال تکیے میں جذب ہو رہی تھی۔ جاویدی غصّے سے کانپنے لگا۔ وہ سلمتا کے بالوں کو پکڑ کر زور سے گرجا۔۔ "کمینہ۔ سُور۔ حرام زادہ" وہ اس کو جھٹکے پر جھٹکے دے دے کر جھنجھوڑ رہا تھا مگر سلمتا بڑی گہری نیند میں سو رہا ہوا جاویدی کے ہاتھوں کو جھٹک کر بڑبڑا رہا تھا۔۔۔ اُنہہ ما ارے باپ مچھر۔ ارے، ارے ہی مچھر"

■ ■

ٹھنڈی اگنی

میری بالکنی کے ٹھیک سامنے ایک دو منزلہ کوٹھی ہے۔ ہر گھڑی آتے جاتے جب کبھی یہاں پر سے گزرتی ہوں تو وہ میری نگاہوں کا مرکز بن جاتی ہے، سامنے دو منزلہ کوٹھی کے اوپر والے حصہ میں کرایہ دار رہتے ہیں اور نیچے کے حصے میں مالک مکان خود ہی رہتا ہے، اپنی کوٹھی کے اوپر والے حصہ میں میں رہتی ہوں، اس لیے سامنے کا مکان جب تب میری نگاہوں میں آجاتا ہے اور میں اپنا ہر ضروری کام چھوڑ کر اس گھر کو دیکھنے لگتی ہوں جہاں کبھی کوئی رونق نہیں چھائی، جس گھر میں زندگی کی مسکراتی ہوئی لہریں کبھی نہیں کوندیں جس گھر کے احاطے میں رنگ برنگ کے پھول تو کھلتے ہیں مگر رنگین آنچلوں کی دھنک مسرتوں کے آسمان پر کبھی نہ جھلکی، اس گھر کے ذرّے ذرّے میں سسکتے ہوئے بے بس آنسوؤں کی نمی ہے، تڑپتے ہوئے دل کی خاموش کراہوں اور تمناؤں کی پوشیدہ لاشوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے میرا جی چاہتا ہے کہ سامنے کی سڑک اور اس کے بعد اتنا بڑا میدان اور پھر اس کے پرے اتنی چوڑی سڑک ہمارے سامنے حائل نہ ہوتی، تب وہ مکان مجھ سے بہت قریب ہو جاتا اور میں صبح سے رات تک یہ دیکھا کرتی کہ روح پر نشتر کیسے لگائے جاتے ہیں؟ انسان خود اپنے ہاتھوں سے کس طرح ایک مظلوم اور کمزور ہستی کو اپنی بے رحمیوں کا نشانہ بناتا ہے؟

یہ دو منزلہ کوٹھی ساری پولس کالونی میں مشہور ہے۔ یہ کوٹھی ادھیڑ سہائے ایڈووکیٹ کی ہے جن کی نوجوانی اور جوانی کی حسن پرستیوں اور رنگینیوں کے تذکرے مدت تک رہے تھے اور ادھیڑ سہائے کی خود پرستی نے اپنے لیے کوئی بندش پسند نہیں کی تھی وہ بہت لمبے عرصے تک آزاد پنچھی کی طرح اڑتے رہے تھے مگر جب ان کی ماں پر بڑھاپا ٹوٹ کر چھانے لگا ان کی آنکھوں کی روشنی دھندلی پڑنے لگی تب وہ اپنے ڈولتے ہوئے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر بیٹے کو منانے لگیں کہ اب اس اجاڑ گھر کو بہو کی روشنی سے جگمگا دو سہائے نے پہلے تو بہت ٹالنا چاہا مگر ایک دن اس نے شیو کرتے ہوئے آئینہ میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے آخری کناروں پر عمر کی لکیریں سمٹ آئی ہیں۔ پہلی بار وہ یکبارگی چونکا۔ "ہاں" تو ادھیڑ سہائے جی! کھیل ہی کھیل میں آپ نے اتنا سمے بتا دیا نا؟"

بیٹے کو ذرا شانت دیکھتے ہوئے ماں نے رشتہ دار عورتوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بہو کی تلاش شروع کر دی تھی۔ شناسا لوگوں نے تو سہائے کی موہنہ زور جوانی کے پیش نظر کانوں پر ہاتھ رکھا مگر سہائے کی ماں کو تو اپنے بیٹے کے لیے سچ مچ کسی اپسرا جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی، مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں ایک لڑکی پسند آگئی، ناک نقشے سے اچھی اور کھلتا ہوا رنگ، جس کو زمانے کی ہواؤں سے بچا کر جیسے رکھا گیا تھا، بن ماں کی بچی جو سوتیلی ماں کی چھاؤں میں مشکلوں سے پنپ سکی تھی۔ دبی دبی سی سمٹی سمٹی سی یہ لڑکی انھیں بہت پسند آئی۔ ساس کے لیے تو ایسی ہی بہو سوبھاگیہ ہوتی ہے۔ ماں کا جی بیاکل ہو اٹھا کیسے اس لڑکی کو اپنے کلیجے سے لگا لے۔ اور اس گھڑی ماں نے اپنے بیٹے کے لیے اس سمٹی ہوئی لڑکی کو مانگ لیا، ماں کے دل میں تھوڑی سی کسک کے

ساتھ ہلکا سا خوف بھی ابھرا تھا اور جو سہائے کو پسند نہ آئی تو! لیکن جلد ہی ماں کو سکون آگیا لڑکیوں کے روپ تو بیاہ کے بعد نکھرتے ہیں، اس دم تو بھی بیر بہوٹیاں بنی ہوئی لڑکیاں اپنے اپنے مردوں کے سنگ ایسے ایسے پر اور پرزے نکالتی ہیں کہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہی لڑکی ہے، بیاہ کے بعد تو ایسے ایسے رنگا رنگ کے پردے اٹھنے لگتے ہیں کہ ان بھول بھلیوں میں اپنی آئی ہوئی عقل بھی ماری جاتی ہے۔ ماں شاید لڑکی ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اوب چکی تھی اس لیے اس نے لڑکی کو پسند کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا۔

اکلوتے بیٹے کی شادی کی تمنا ماں کے دل میں اب تک کیسے کیسے گل بوٹے کھلاتی رہی تھی، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیوں اور رنگینیوں سے اپنے گھر کو کس طرح سجالے ایک دن اودھیش سہائے نے ماں کو بڑے ارمان اور لاڈ سے بہو کے جوڑے سنوارتے دیکھا تو اچانک ہی پوچھ بیٹھا "ماں تم تو جانتی ہو کہ میری آنکھوں نے کیسی جل پریوں اور سورگ کی اپسراؤں کو دیکھا ہے میرے البم ان کی تصویروں سے بھرے پڑے ہیں، اب جو تم ایک انجان سی لڑکی کو میرے جیون کی ڈور میں جنم جنم کے لیے باندھ رہی ہو، تو میرا من کبھی کبھی بڑا اداس ہو جاتا ہے کہ نجانے یہ سنجوگ کیسا ہوگا۔ میں اس کے ساتھ کتنی دور تک جا سکوں گا ماں میں تو اب تک بجلی کے سمان رہا ہوں جو کبھی ایک ہی جگہ نہیں چمکتی۔ پھر؟ میری پیاسی آتما کو شانتی مل جائے گی؟ بس ایک ہی آنچل کے چھاؤں میں میری کامنائیں پوری ہو جائیں گی؟"

ماں کا دل کانپ گیا" اودھیش! مجھ کو دیکھ بیٹا میں بھی کسی پتی کی پتنی ہوں۔ بیٹا پتنی کے گن دیکھے جاتے ہیں، اس کے نرت کلا نہیں دیکھتے بہوئیں گھر بساتی ہیں پروار بناتی ہیں ان کے پیروں سے گھنگھروؤں کی چھما چھم

کے بول نہیں اُبھرتے، ان کے بہو کی ایک بوند ایسی ہوتی ہے کہ اس کی لالی مانگوں کا سیندور اور ماتھے کی بندیا بن کر ہکتی ہے۔ ماں اتنا کہہ کر بھی بے چین رہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بھگوان نہ کرے کسی دولت مند کا باپ اسے اکیلا چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے۔ کتنے دکھوں کے ساتھ اپنی بھری جوانی میں اس نے اپنے بچے کو پالا تھا مگر اتنا کر لینے کے بعد بھی وہ اودھیش سہائے کو اس کے رنگین مزاج دوستوں سے چھڑا نہ سکی تھی۔ آج اس خوبصورت کوٹھی میں ساری سندرتا بھری پڑی تھی مگر پھر بھی کتنی اداسی برس رہی تھی۔ ماں نے بہو کے جوڑے بڑے پیار سے سنوار کر رکھے تھے گہنوں کے کئی جوڑے اپنی پسند سے بنوا کر اس نے اپنی آئرن سیف میں رکھے تھے اور سب سے آخر میں اس نے لال رنگ کے ڈبے کو بڑے ارمان سے دیکھا جس میں بہو کے لیے سہاگ سیندور تھا۔ بڑھیا ماں کی ڈولتی ہوئی گردن میں بیٹے کی بیاہ کی خوشی سے جیسے طاقت بھر گئی تھی، اس نے بدبداتے ہوئے اپنی بہو اور بیٹے اور بڑھنے والے ونش کے دعائیں مانگیں اور سیندور کا لال ڈبہ چمکتی ہوئی ساڑیوں پر سب سے اوپر رکھ دیا۔

ماں نے بارات لے جانے اور پوری شادی میں اپنے پرس کا منہ کھول دیا تھا۔ اندر سے باہر اور باہر سے اندر تک ماں جی کا چرچا لگ رہا تھا دور دور کے رشتہ دار بھی آ گئے تھے، ہاتھی، گھوڑے، ساز و سامان، روشن چوکی، بینڈ باجے، میلوں مرکری روشنی کے تمام جھام لیے جب بارات دلہن کے دروازے پر پہنچی تو دوستوں کے ساتھ دولہا کی نگاہیں بھی رنگیں چھماتے آنچلوں میں سندرتا کی کھوج میں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

گیندے کے پھولوں سے سجے سجائے منڈپ میں رنگین شگونوں دھان کی

کھیلوں اور پوجا کی بہت سی چیزوں کے ساتھ دو پیڑھیوں پر آنے سامنے دولھا دلھن کو بیٹھا دیا گیا تھا دلھن لمبے گھونگھٹ کے بوجھ تلے اتنی جھکی بیٹھی تھی کہ اودھدیش سہائے کوشش کرنے پر بھی اسے نہ دیکھ سکا تھا۔ لو ترا گنی دوب اور چندن کی جلتی ہوئی باس سے گنگ رہی تھی اشلوک پڑھے جا رہے تھے اگنی پھیرا سے پہلے جنم جنم کی گانٹھ جب باندھی جانے لگی تو سہائے کو اپنی سانس گھٹتی ہوئی لگی لیکن وہ اس سیدھی سادی لڑکی کے ساتھ اگنی پھیرے کرتا چلا گیا۔ بوڑھا پروہت کون کون سے اشلوک پڑھ پڑھ کر اس کو کیا کیا کہہ رہا تھا کس کس سمے کی یاد دلا رہا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ بس زندگی کا سب سے بڑا چکر لو ترا آگ کے سمندر کے گرد آتما کا ایک آخری چکر پورا کر رہا تھا اور اس کے رُوم رُوم میں ایک گھبراہٹ سی مچی ہوئی تھی ایک عجیب ابال سا وہ محسوس کر رہا تھا کیا اس کے قدموں کے نیچے انگارے سے بچھ گئے تھے یا جوانی کے کھیل اس اگنی پھیرے سے کہیں زیادہ من موہن تھے؟ یا شاید لمبے گھونگھٹ کے پردے نے اس میں بغاوت کی لہر پھونک دی تھی۔ جیون کا سب سے بڑا اور سب سے آخری پھیرا جس گھڑی ختم ہوا تو ٹھنڈک کے ہوتے ہوئے بھی وہ پسینے سے شرابور تھا رات کے تین بج رہے تھے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ کہیں بھی کسی جگہ بھی سو جانا چاہتا تھا۔

برات جب واپس لوٹی تو ماں نے شگن کا تیل گھر کے پہلے چوکھٹ پر ڈالا اور اپنے بیٹے کی باہیں پکڑ کر دلہن کے ساتھ ساتھ چوکھٹ پار کرانا چاہا تھا۔ مگر سہائے ماں کا ہاتھ جھٹک کر جلدی سے اکیلا ہی اندر چلا گیا۔ بڑھیا ماں تکتی رہ گئی بہو لوگوں کی جھرمٹ میں شرمائی، لجائی اکیلی کھڑی تھی۔ ماں کا دل پہلے ہی ڈر رہا تھا اودھدیش جو اتنے دنوں بے نکیل پھرتا پھرا ہے تو پہلے پہل گرہستی

کا بندھن ضرور ہی اس کو بُرا لگے گا۔

مہانوں اور چمکیلی ساڑیوں، رنگا رنگ کے کپڑے کی بہاروں سے اس گھر میں رونق آگئی تھی۔ بہت سی نو بیاہتا لڑکیوں نے سہاگ رات کے لیے دلہن کا کمرہ سجادیا دلہن کے سنگار سے کمرہ کم سجا نہ تھا۔ پھولوں کی لڑیاں چھپر کھٹ کے چاروں طرف سہرے کی لڑیوں کی طرح ایسی سجی جھوم رہی تھیں کہ بس ان کے اندر سے چھپر کھٹ پر دلہن کی زرنگار گھونگھٹ کی جھلکیاں ہی نظر آرہی تھیں سائڈ ٹیبل پر دودھ کا جگ، شیشے کا گلاس اور مٹھائیوں سے بھرا تھال رکھا تھا۔

رشتے داروں کی نئی نویلی بھابھیوں نے اودھیش کے کان میں جھک جھک کے سرگوشیوں میں نجانے کیا کیا رس بھرے تھے مگر اودھیش کے چہرے پر کوئی نیا رنگ روپ نہیں تھا اس کی آنکھیں ابھی تک اداس اور بوجھل ہو رہی تھیں۔ آخر جب شگن کا سمے ہو گیا تب اودھیش کو سہاگ رات کے جگمگاتے ہوئے کمرے میں پہونچا کر دروازہ بند کر دیا گیا۔

اودھیش نے پھولوں کی خوشبو اور بہار کے سارے رنگوں سے گلزار بنے اس کمرے کو دیکھا کہکشاں کے چمکتے ہوئے راستے پر سے ہوتے ہوئے جب چھپر کھٹ سے لٹکتے ہوئے پھولوں کی لڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا کر وہ گردن جھکائے، سمٹی ہوئی دلہن کا ستاروں بھرا گھونگھٹ اٹھانے لگا تو اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اس نے بہت دھیرے سے گھونگھٹ اٹھایا اور جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر چکرانے لگا ہے۔ اس کے پیروں میں کپکپاہٹ ہونے لگی تھی اور اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا جیسے اب وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کو اپنی ساری طاقت ختم کر رہا ہے۔ اس نے مسہری کی پٹی کو زور سے پکڑ لیا آنکھیں

آپ ہی آپ آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس کو لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہوتا جارہا ہے دل کی تیز دھڑکن سے کانوں میں سنسناہٹیں سی ہو رہی تھیں۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی اک تھرتھراہٹ ابھری۔ بھگوان!

اور اودھیش پچھلے دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس حادثے کو گزرے ہوئے تیس سال ہو چکے ہیں، بوڑھی ماں سسکتی اور بیٹے کو مناتی خود ہی اس دنیا سے چلی گئی۔ ماں نے بہو کو اس گھر کی چوکھٹ سے باہر کبھی نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس کی ساری دنیا بس اسی ایک کمرے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اودھیش نے اس تیس سال کے لمبے عرصے میں کبھی اس لڑکی کو دیکھنا نہ چاہا تھا، جو اس گھر میں ایک الہڑ لڑکی سے ایک غمزدہ عورت بن کر اب بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہی تھی وہ معصوم اور حیران آنکھیں اب ایک عمر رسیدہ عورت کی سوگوار اور ویران آنکھوں میں بدل گئی تھیں اودھیش کی اس نے کبھی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی مگر یہ دو منزلہ کوٹھی کا نچلا حصہ ایک عجیب غمناک کہانی سناتا رہتا ہے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے سے اتنے الگ تھے کہ سر راہ اگر وہ مل بھی جاتے تو ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے، دبی دبی سمٹی سمٹی ہوئی سی لڑکی، اس گھر کے تہہ خانوں میں اس طرح چھپ کر رہ گئی تھی کہ تیس سالوں سے جس کی اپنی ہستی بھی خود اپنے لیے ہمیشہ کے لیے مٹ چکی تھی۔

وہ اودھیش کی آواز سنتی، اس کے دوستوں کی آؤ بھگت دیکھتی، ملازموں سے ہر روز کی باتیں سنا کرتی۔ اس طرح اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اودھیش نے اپنے البم سے اپنی دوست لڑکیوں کی ساری تصویریں انلارج کرا کے اپنے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں لگا رکھی ہیں۔ یہ بات اس کی ساس نے بھی بتائی تھی کہ وہ جو اس کی دوست لڑکیاں تھیں انہی جادوگرنیوں نے میرے کومل جیسے بیٹے پر جادو

کر دیا ہے اور اب اینت کی بڑی بڑی رنگین تصویریں کمروں میں لگائی گئی ہیں۔ کر وہ بھولی بھالی لڑکی اپنی ساس کی باتیں سنکر اس وقت رو پڑی تھی اور اب؟ اب تو وہ ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔

صبح کی سنہری دھوپ اس کوٹھی کے ذرّے ذرّے کو جگمگا دیتی احاطے کے پھول لہک اٹھتے، دوپہر ہوتی۔ شام کا سُرمئی دھندلکا ہر روز کی طرح چھا جاتا اور ہیش کی بجاتی اندر آتی ہوئی گاڑی کا ہارن ایک ہی طرح سے ہر روز دن کی روشنی اور رات کے اندھیروں میں گونجتا اور جب سارا شہر سو یا رہتا تو وہ بہت دیر تک جاگتی رہتی، زندگی بھر کی تمنائیں اس کے دل کو جھنجھوڑنے لگتیں، پیاسی آتما تڑپ اٹھتی، مانگ میں دمکتے ہوئے سیندور اس کے ادھورے سپنوں کی یاد دلاتے۔ اس کا جی بیکل ہو اٹھتا تصور میں اس کا کوئی بچہ اس کے سینے سے لگ جاتا، کوئی ہمکتا ہوا بچہ اسکی گود میں آنے کو مچلنے لگتا۔ مگر وہ اکیلی اندھیرے کمرے میں سسکتی رہتی۔ ویران آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہتے، کمرہ اُجاڑ پڑا رہتا۔ اور ہر روز کی طرح پھر یہ رات بھی دھیرے دھیرے چپکے سے بیت جاتی۔

——

تلاشِ منزل

آج اچانک لیٹے لیٹے اُسے یاد آیا کہ کبھی اس کا نام سلمیٰ بھی تھا۔ سلمیٰ جس کے گھر کے آنگن میں جامن کا ایک درخت تھا اس درخت میں ہمیشہ سلمیٰ کے لیے ایک جھولا لگا رہتا تھا، جھولا جھولتے ہوئے وہ بڑے رسیلے گیت گایا کرتی تھی۔ سلمیٰ ایک سانولی سلونی سی لڑکی تھی جو سر کو دوپٹے سے ڈھانکے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنی گڑیا اور گھروندے سے کھیلا کرتی تھی، اس کے کانوں میں چاندی کی چھوٹی سی نتھیا بجلی تھی، گھر کے کچے آنگن میں وہ ایک تیتری کی طرح اُڑتی پھرتی تھی۔ پھر پتہ نہیں یک بیک اس کی چھوٹی سی نتھیا اور معصوم بھولی بھالی صورت پر جوانی کیسے اتنی جھوم کر آئی کہ اچانک آنگن کی دیواریں تک سمسا کر بیٹھ گئیں، اور سلمیٰ شعر و نغمے کی دوسری سلماؤں کی طرح اپنے ارمانوں کی وادی کی طرف رات کے اندھیرے میں چپکے سے نکل گئی۔ تب اس سے اس کا اپنا نام چھن چکا تھا۔ اب وہ مینا تھی چھلکتی ہوئی مینا۔ عشق و محبت کی روایتی کٹھن راہوں میں، اس نے اپنے محبوب کے قدموں پر نثار ہو جانے کی ہزاروں قسمیں کھائیں، مگر اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کی طرح وہ بھی ایک دن اکیلی رہ گئی تھی۔ چاروں طرف

اندھیروں کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔۔ نہ کہیں راستہ تھا اور نہ کوئی منزل ۔
اب وہ جاتی بھی کہاں ؟ ایسے اندھیرے میں سانس تو گھٹتی محسوس ہوتی ہے
مگر، گھٹتی کہاں ہے ؟ ۔۔ وہ اپنے کچے آنگن سے نکل آئی تو تھی مگر باہر کی
دنیا کی اس کو خبر نہیں تھی ۔ آخر تھک ہار کر اس کے قدم انجانے میں ایک
جگمگاتی ہوئی محفل کی طرف بڑھے ۔ وہ ٹھٹھک گئی ۔۔ یہاں کیا ہو رہا تھا؟
کسی کی شادی ہو رہی تھی ۔ ؟ ۔۔ دولھن کو دیکھنے کے لیے اور آگے بڑھی ۔ ہر طرف
روشنیوں کے جھماکوں سے اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں ۔۔ ! اب وہ مینا
بھی نہیں رہی تھی، یہ تو بڑا پرانا نام تھا ۔ اس کا نام کملیش رکھا گیا جو پکارنے
میں بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے اور اس نام سے ایک نغمے کا احساس اُجاگر ہوتا
تھا ۔

یہاں آکر اس کی ناک میں سونے کی نتھیا ڈال دی گئی تھی ۔ اس کو چلنے،
مُسکرانے اور ہنسنے کے نئے انداز سیکھنے پڑے تھے، اس کے قدموں تلے دلوں
کو پیسنے، مسلنے اور پیار و قدر کرنے والی صلاحیتیں پیدا کی گئی تھیں ۔ سلمیٰ
گھر کے آنگن سے نکلتے ہی مر گئی تھی ۔۔ مینا اپنے محبوب کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے
خود ہی کہیں کھو گئی ۔۔ مگر روشنیوں کے جھماکوں میں ایک نئی زندگی
اُبھر رہی تھی ۔۔ کملیش جس کے گھنگروؤں کے بول میں نہ جانے کتنے دلوں
کی تمنائیں مچل رہی تھیں ۔۔ کملیش کو اپنی اداؤں، حُسن اور کمال ستمگری
کا احساس تھا بھولا بھالا چہرہ جادو جگانے میں اپنی ساحری سے آگاہ ہو چکا
تھا، جھکی ہوئی آنکھوں کی شرمیلی، گھنی پلکیں، جب اچانک کسی طرف
اٹھ جاتیں تو اس وقت کئی دلوں میں زلزلے سے آجاتے تھے ۔ کملیش ایک
مدہوش شرابی کی طرح ناچتے ناچتے جب لڑکھڑانے لگتی تو بیتابانہ طور پر

اس کا جی چاہتا کہ کسی کی مضبوط باہیں اس کو سہارا دینے لگیں۔ باہنوں کی گرفت سے اب وہ تھک چکی تھی۔ اس کی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہوئی زندگی کو ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ گھورتی آنکھوں کے نشے پی پی کر اب وہ اتنی ہوش میں آچکی تھی کہ کبھی اس کا دل چاہتا کہ کسی کی روٹھی ہوئی نگاہوں کو منالے۔ کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں اس کی روح جیسے بھٹکتی پھر رہی تھی ـــــ! مگر نہ کسی راستے کا اسے علم تھا اور نہ کہیں اس کی منزل کا نشان تھا ـــــ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگی تھی، جب کبھی آسمان پر بادل منڈلاتے یا بارش ہونے لگتی، اس وقت بے اختیار کملیش کو اپنے گھر کا بھیگا بھیگا کچا آنگن یاد آجاتا تھا، وہ تڑپ جاتی سوندھی سوندھی خوشبو والے آنگن میں ایک بار صرف ایک بار وہ بے خبر ہو کر سو جانا چاہتی تھی، بس یہی ـــــ یہی تو اک تمنا اس کو بے چین کیے رہتی تھی۔ بجلیوں کی اس جگمگاتی ہوئی محفل سے اب اس کا دل اچاٹ ہونے لگا تھا۔ وہ جی بھر کے سونا چاہتی تھی، ایک عرصے تک کسی ناسمجھ بچے کی طرح ہر چمکتی ہوئی چیز کی طرف وہ کھنچی چلی جا رہی تھی مگر اب جیسے اس کو عقل آتی جا رہی تھی ـــــ اتنے دنوں کے بعد اپنی زندگی کی معصومیت کو یاد کر کے وہ تڑپ اٹھتی ـــــ! کئی بار بے اختیار ہو کر اکیلے میں وہ اپنے قدر دانوں سے پوچھا کرتی ـــ "کیا تمہارے گھر کے آنگن میں کوئی پیڑ اُگا ہوا ہے؟ ـــ اور رات کے وقت جب چاند، آنگن کے درخت کے پتوں سے جھانکتا ہے تو تمہیں بھی رات کے سناٹے میں ایک اکیلا جاگتا ہوا چاند اچھا لگتا ہے؟ ـــ!

کملیش اپنے ماحول سے دور ہو کر اپنے آپ میں گم ہوتی چلی گئی۔ سارے راستے تو اس نے اپنی زندگی سے خود ہی مٹا دیے تھے ـ پھر اب

وہ کون سی ڈگر پر چلتی ــــ ! وہ بکھری بکھری سی نظر آتی ــــ گھنگروؤں کے سارے بول ــــ چوڑیوں کی ساری کھنک اور اس کے گیتوں کے سارے رس جیسے کسی نے چُرا لیے تھے ــــ وہ اپنی کھوئی ہوئی نگاہوں سے در و دیوار کو تکتی ــــ سلمیٰ اب تو اور کیا بنے گی ؟ ــــ ! دل سے اک آواز نکلتی اور کملیش کا تپ کر رہ جاتی اس سے زیادہ گھور اندھیارا اب کیا ہو گا ــــ ! ؟ یہ رات ایک ایسی رات تھی ، جس کا کبھی کوئی سویرا نہیں تھا ــــ ! رات سے پھر اندھیاری رات ہی جنم لیتی ہے اور اس طرح اندھیرے پر اندھیرے کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں ــــ اور یہی سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے اور اپنی سیاہیوں میں پلنے والے پھر ہمیشہ کے لیے سسک سسک کر مٹتے چلے جاتے ہیں ــــ ! اپنی ناک میں چاندی کی نتھیا ڈولاتی ہوئی سلمیٰ تو اپنے آنگن سے نکلتے ہی مر چکی تھی ــــ مینا چند ہفتوں کے لیے پیدا ہو کر مٹ گئی ــــ مگر یہ کملیش ! یہ اب کبھی نہیں مرے گی ــــ وہ گھٹ گھٹ کر جیے گی ۔ وہ ساری ساری رات جاگتی ہے اور اس کی موت کو شاید کہیں نیند آ گئی ہے ۔ جیسے کوئی پرندہ ، پنجرے میں بند ہو کر تڑپتا ہے ــــ کملیش اسی طرح تڑپ تڑپ کر دن کاٹ رہی تھی ، پتہ نہیں اس کی روح میں اچانک کیسے انقلاب آ جاتا تھا کہ معصومیت کی چہار دیواری کو ڈھا کر اچانک سلمیٰ سے مینا بن گئی تھی ــــ اور اب اسی ٹوٹی ہوئی دیوار سے کچے آنگن میں جانے کے لیے اس کی روح لہو لہان ہو رہی تھی ۔ شیفون اور سلکن ساڑیوں اور پشوازوں میں اس کو اپنا جسم زخمی ہوتا نظر آتا تھا ۔ بڑی حسرتوں سے وہ اپنے موٹے موٹے اُن دوپٹوں کو یاد کیا کرتی جو اس کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتے تھے ــــ اس کے دل میں بار بار یہی اک تمنا

بیدار ہوتی تھی کہ ۔۔۔ ایک، کچے آنگن کا چھوٹا سا گھر ہو ۔۔۔ اور گھر کی دہلیز پر بیٹھی وہ کسی کی راہ دیکھتی رہے، مگر اس کچے آنگن والے چھوٹے سے گھر کے اندر آنے کے لیے تو کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ کوئی پگڈنڈی تک نہیں ایسے جنگلوں میں کانٹوں سے الجھتا، اپنے گریبان کی دھجیاں بکھیرتا لہو لہان تلوؤں سے، کسی کے لیے کون آجاتا ہے؟ ۔۔۔ اس آنگن سے تو ایک دلہن کی ڈولی نکلنے والی تھی ۔۔۔ آنے والا تو ڈولی لے کر ہی آتا ہے نا ۔۔۔؟

پھر اب اس مری ہوئی سلمیٰ کے لیے کون آئے گا؟ وہ اپنی نگاہوں میں تمناؤں کے دیے جلائے کس کا انتظار کر رہی تھی ۔۔۔! سلمیٰ اپنے آپ کو سمجھاتی، مگر اس کی راتیں جو سیاہ سے سیاہ تر بنتی چلی گئی تھیں پھر بھی انجانی کرنوں کی بھیک مانگنے لگی تھیں ۔۔۔! کملیش نے زندگی کے جس ویرانے میں اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹ دینا چاہا تھا اب اس اندھیرے میں آہستہ آہستہ وہ اپنا سر اٹھانے لگی تھیں ۔۔۔ کملیش بدحواس تھی ۔۔۔ کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا اپنی بوکھلاہٹوں کے ہاتھوں وہ کڑی سزائیں بھی پاچکی تھی ۔۔۔ مگر اس کا وحشی دل پھر بھی مچلا چلا جا رہا تھا۔

آٹھ مہینوں کی کوششوں کے بعد کملیش کو اس محفلِ رنگ و بو سے نکل بھاگنے کا موقع مل ہی گیا ۔۔۔ وہ اپنے چہرے کو چھپائے رکشے پر بیٹھی بڑی تیزی سے بازارِ حسن سے دور ہوتی چلی گئی ۔۔۔ دل کے دھڑکنے اور جسم کے تھرتھرانے کی اسے کوئی پروانہ تھی ۔۔۔ وہ رکشے کو تیزی سے چلواتی گئی ۔۔۔ کوئی اسے دیکھ نہ لے، اسے پہچان نہ لے۔

میلوں دور اس نے غریبوں کی چند جھونپڑیاں دیکھیں ۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا ۔۔۔ کہیں یہی تو اس کی منزل نہیں ہے ۔۔۔؟ وہ رکشے سے اتر گئی۔

چندمرجھائی صورتوں والی عورتوں نے بڑے تعجب سے اسے دیکھا۔

" تم کہاں سے آ رہی ہو جی "؟ — ایک عورت نے بڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

" بہن جی! میں گھر سے آ رہی ہوں — تم ہی لوگوں کے پاس۔ بس مجھے اپنے گھر کے ایک کونے میں پڑا رہنے دینا — ہاں اور کچھ نہیں۔!

" ہونہہ! اور تو ہوا ہی کر رہے گی نا؟" — ایک جھڑ جڑی سی بڑھیا آگے آ کر دھتکارتی ہوئی بولی۔

" بہن جی! میں آپ سب لوگوں کے کام کر دیا کروں گی۔ اور اس منّے کو سارے دن کھلاتی رہوں گی۔ کملیش نے قریب ہی گندے بستر پر سے ایک کالے کلوٹے میلے کچیلے بچّے کو اٹھا کر بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگایا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں — شاید یہی! — یہی تو اس کی منزل تھی۔!

" ارے او بیوا — تجھ کو اک میرا ہی گھر جلانا رہ گیا تھا۔؟" ایک عورت نے اس کی گود سے اپنا بچّہ کھینچ کر کہا۔

" ہاں — ہاں — ذرا دیکھو تو اس کے لچھن۔ پیٹ کا مارا تو پہلے ہی تھا اب اس بتریا کے رہتے بیٹا داماد بھی اپنا نہ رہے گا — یہ جھلملاتی ساڑی سونے کے ہار اور ماتھے پر بندیا "۔! غصہ میں سر دھنتی ہوئی ایک دوسری عورت نے کملیش کے آگے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا " بھلا یہ لالی سرخی! یہ کسی اشراف کا چہرہ ہے؟ — جا! بھاگ — دور ہو یہاں سے! پتریا کہیں کی —!"

کملیش حیران رہ گئی۔ بھاگنے کی جلدی میں اس نے اپنے چہرے

اور کپڑے کی طرف بھی کوئی دھیان نہ دیا تھا۔ وہ مری ہوئی چال سے
چلتی ہوئی ایک درخت کے تنے کے سہارے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے
بڑی درد بھری نگاہوں سے اونچے آسمان کو دیکھا۔ اللہ! اب کیا ہوگا؟
اسے ایک مدت پر خدا یاد آیا تھا۔

— —

بے نام

ٹی۔بی سنٹر کی عمارت کے قریب میں اچانک ہی بے ارادہ رک گیا۔ ہفتہ پہلے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اسلم پر ٹی۔بی کا شدید حملہ ہوا ہے اور اسے یہاں لایا گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کے مرض کو مہلک کہہ دیا تھا کہ اسلم کے دونوں پھیپھڑے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ اسلم میرے خاص دوستوں میں سے نہیں تھا، لیکن ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف ضرور تھے وہ میرے شہر کا رہنے والا تھا پھر انسانی ہمدردی کا اظہار بھی اپنے آپ کو تسکین دینے والا ہوتا ہے۔

میں اوپر کے پرائیویٹ روم میں جا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹروں اور مریضوں کے ہجوم میں ٹی۔بی سنٹر کے ڈائرکٹر کی نظر مجھ پر پڑ گئی وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے تھے۔ انھوں نے اسلم کا نام سنتے ہی مجھے بتایا کہ اب وہ زیادہ دنوں تک نہیں بچ سکے گا اس کے علاج میں بہت دیر ہو چکی ہے۔

اسلم کو دیکھ کر میرا دل اداس ہو گیا، اس نوجوانی کی عمر میں موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی، یہ وہ اسلم ہی نہیں لگتا تھا جس کو میں جانتا تھا زرد چہرہ، سوکھے ہوئے لب، اسلم اپنا اک سایہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلا تھا، میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہاں کی ایک نرس

اس پر بہت مہربان ہے، اسی لیے اس نے گھر والوں کو واپس کر دیا ہے۔ اسلم کی بے رونق آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی ــــ تیسرے وہ چھوٹی سی مسکراتی ہوئی نرس زندگی بانٹتی ہے، اس کی آنکھوں کی گردش میں حیات کے پیمانے چھلکتے ہیں؛" میں ہنس پڑا۔ یہاں آکر تم تو ایک شاعر بن گئے ہو" ہماری بات ہو ہی رہی تھی کہ ایک سانولی، دبلی پتلی چھوٹے قد کی شرمائی لجائی سی لڑکی جوس کا گلاس لیے اسلم کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور بڑی سریلی آواز میں مسکراتی ہوئی بولی:" بتاؤ۔ اچھے تو ہونا؟" اس کے ہموار خوبصورت دانت مجھ کو بہت اچھے لگے۔" ان سے ملو۔ یہ میرے دوست ہیں قیصر"۔" میں ضرور مل لوں گی بھئی! پہلے یہ جوس تو پی لو۔" وہ آپ ہی آپ نئی دلہن کی طرح شرمائی جا رہی تھی۔!

اسلم نے بتایا تھا کہ اس لڑکی کا نام سائن ہے اور اسی ٹی۔ بی سنٹر میں اس کی ڈیوٹی بھی لگی ہوئی ہے۔ کچھ مہینے پہلے جب اسلم یہاں لایا گیا تھا تو اس جگہ کے در و دیوار سے اسے وحشت ہوتی رہی تھی، وہ اپنے سینے میں چند ہی گنتی کے سانس محسوس کرتا رہا تھا، مگر جب سے سائن یہاں آگئی ہے، اس چھوٹی سی سمٹی ہوئی لڑکی نے اس کے اندر جینے کی تڑپ پیدا کر دی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ گھنٹوں اس کے لیے یہاں رکی رہتی ہے، اسلم کے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے برش کرتی ہے، اسپنجنگ کر کے اس کو سنوارتی رہتی ہے، پوڈر اور سنٹ کی خوشبو سے فنائل اور ڈیٹول کی بدبو کو چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ جس روز اس کا بخار تیز ہو جاتا ہے، وہ ساری رات برف کی ٹوپی کے ساتھ یوڈی کلون کی پٹی بھی اس کی پیشانی پر بدلتی رہتی ہے اور جب وہ کچھ بہتر ہونے لگتا ہے تو اسے چاندنی راتوں کے فسوں، گنگا کی تڑپتی

اور جھلملاتی ہوئی لہروں کی باتیں سناتی ہے، وہ دنیا بھر کے حسن اور اس کی رنگینیوں کی جھلکیاں بڑے پیارے انداز میں جیسے اس کی آنکھوں کے آگے دکھاتی رہتی ہے۔" اسلم نے قیصر کو بتایا کہ سائن اپنے پیار کے سحر سے اس کو زندگی کی طرف کھینچ رہی ہے، مگر اس ٹی۔ بی سنٹر میں اکیلا ایک وہی تو بیمار نہیں ہے، پھر صرف اس پر کیوں اس قدر مہربان تھی، یا پھر وہ اتنی کشادہ دلی کے ساتھ سارے مریضوں کو اپنے ہاتھوں سے آب حیات پلانے کا انداز جانتی تھی؟ اسلم کے پژمردہ لبوں پر حیات آگیں مسکراہٹوں کو دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ وہ موت پر فتح پالے گا، سائن کی محبت اس کو کبھی مرنے نہیں دے گی۔

میں دوسری بار اسلم سے مہینوں بعد جب ٹی۔ بی سنٹر ملنے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر بڑے پیار سے لپٹ گیا" قیصر: اب میں بہت اچھا ہوں، اسی وارڈ میں مجھے تھوڑی دور تک ٹہلنے کی اجازت مل گئی ہے، اکسرے میں میرے پھیپھڑے کے زخم کافی حد تک صحت مند ہوتے جا رہے ہیں۔ بتاؤ، میں پہلے سے بہتر نظر آرہا ہوں نا؟" بہت خوش ہو کر اسلم ایک ہی سانس میں اتنی ساری باتیں کہتا چلا گیا۔ وہ پہلے سے بہت اچھا تھا۔ اس کے لبوں پر اب خون کی لالی تھی، چہرے پر خوشیوں کی تابانی اور آنکھوں میں زندگی کی رونق آگئی تھی، اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ میں نے دلی خلوص سے اس کو مبارکباد دی۔ وہ ہنس پڑا! "میری زندگی کو موت کے منھ سے سائن نے چھینا ہے۔" اسی وقت ایک چھوٹی سی ڈش لیے سائن کمرے میں آگئی۔ وہ اسی طرح سے چلتی ہوئی میرے پاس آکر ٹھہر گئی۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، سانولا رنگ دمک اٹھا تھا، اس کے سفید خوبصورت دانت جھلک رہے تھے۔" آپ نے اسلم کو دیکھا؟ انھیں سمجھائیے کہ میری باتیں مان لیا کریں۔" وہ بڑے

نازسے تشنہ برساتی ہوئی آواز میں بولی؛ اور چمچہ سے فروٹ سلاد اسلم کو کھلانے لگی۔

"اسلم بچارہ تو اپنی زندگی آپ کے قدموں پر ہار چکا ہے۔ اب میں اس کو اور کیا سمجھاؤں، اس کی رگوں میں آپ کی محبت کا لہو چھلک رہا ہے، اس سے پہلے محبت کے اعجاز پر میرا ایمان اتنا کامل نہیں تھا۔ آپ نے سچ مچ مسیحائی کی ہے۔" سائمن ہنستی ہوئی چلی گئی تو اسلم نے بڑے پیار سے کہا۔"قیصر! میں سائمن سے شادی کر رہا ہوں۔"

"شادی؟" میں چونک پڑا۔ کہیں ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ پھیپھڑے کے زخموں کو ہرا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ کیا تم اپنی محبت اور زندگی دونوں کو قربان کر دینا چاہتے ہو؟"

مگر اسلم پر کچھ ایسی وارفتگی چھا رہی تھی کہ اس کے ارادہ کو بدلنا آسان نہ تھا۔ ایک عالمِ جذب و کیف میں ڈوبا ہوا وہ اپنی زندگی کے نقشے بنا رہا تھا۔ ویسے بھی میں جانتا تھا کہ اس بیماری میں خود سپردگی کی ایک نفسیاتی لذّت خاص طور پر محسوس ہوا کرتی ہے۔ واپس لوٹتے وقت رحم اور افسوس بھری نگاہوں سے جب میں نے اس کو خدا حافظ کہا تو زینے پر سے اترتے ہوئے میرے پیر کانپ رہے تھے، بچارا اسلم۔ پتہ نہیں اسے دوبارہ دیکھ بھی سکوں گا؟

میں اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس میں اس طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ ٹی۔بی سنٹر کی یاد بھی نہ آئی۔ لائبریریوں کے چکّر نے نڈھال کر رکھا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ہارڈنگ پارک میں اچانک اسلم سے میری ملاقات ہوگئی "ارے! یہ تم ہو؟" بے اختیار میرے منھ سے نکل گیا۔ وہ اسی پرانے انداز سے مسکرایا۔ سائمن اس کے ساتھ تھی وہ دونوں پھولوں کے ایک کنج میں بیٹھے ہوئے تھے، لہکا ہوا سبزہ ان کے قدموں میں بچھا ہوا تھا، پھولوں کی رنگینوں

پر حسن اور بہاریں چھا رہی تھیں۔ ہوا میں خوشبو رچی ہوئی تھی اور فضا میں رنگ و آہنگ اور پیار و مسرت کا فردوسی نغمہ جادو جگا رہا تھا۔

اسلم بڑے پیار بھرے لہجے میں بولا "قیصر! میری بیگم شبنم سے ملو۔ اب یہ سائمن نہیں شبنم ہیں"۔

"اوہ! مبارک ہو بھئی، بہت بہت مبارک! تم نے بڑا خوبصورت نام دیا ہے شبنم! جو پھولوں کو رنگ اور حسن و تازگی بخشتی ہے۔ گیہوں کے سنہرے کھیت جس سے زندگی حاصل کرتے ہیں، جو ہیرے سے بڑھ کر آب دار ہوتی ہے اور جس پر سورج کی کرنوں کے ساتوں رنگ انگڑائیاں لیتے ہوئے بیدار ہوتے ہیں۔ مگر! مگر تم نے یہ شبنم ہی نام کیوں رکھا؟ کچھ اور بھی رکھ سکتے تھے؟ سورج کی کرنوں کو یاد کرتے ہوئے میں گڑبڑا گیا تھا۔ میں تو انھیں سائمن ہی کہتا رہوں گا، مہربان، ہمدرد۔ سراپا پیار و محبت۔ جس کی ہر ایک جنبش نظر حیات و مسرت کی پیام بر ہوتی ہے"۔

اسلم ہنس پڑا۔ "پہلے دن جب تم مجھ سے ملے تھے تو میری باتوں کو سن کر مجھے شاعر کہا تھا اور اب تو ایسا لگتا ہے کہ شاعری کا پورا موڈ تم پر چھایا ہوا ہے"۔

سائمن بیوی سے زیادہ محبوبہ نظر آ رہی تھی، نگاہوں میں شوخیوں کی جھلکیاں تھیں۔ لبوں پر حیا بھری مسکراہٹ اور چہرے پر جیسے شفق لپکی ہوئی تھی۔!

اسلم نے کہا کہ وہ یہاں چک اپ کے لیے آیا ہوا ہے۔ شبنم نے لمبی چھٹی لے رکھی ہے، وہ ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

مہینوں گزرتے چلے گئے۔ اپنا تھیسس داخل کر کے جب میں گھر گیا تو

زہان مجھے اچانک طور پر وہی خبر ملی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ اسلم حیاتِ نو کے نشے میں اتنا بدمست ہو چکا تھا کہ اس کو اپنے پھیپھڑوں کے بڑھتے ہوئے زخموں کا اندازہ بھی نہ کر سکا، وہ شبنم کی باہوں کے سہارے زندگی کی ساری مسرتیں حریصانہ طور پر حاصل کرتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے پھیپھڑوں کے زخم پھٹ گئے۔ اس کے منھ اور ناک سے جسم کا سارا خون بہہ گیا اور ہوسپٹل لے جاتے ہوئے راستے ہی میں وہ شبنم کا ہاتھ تھامے ہوئے بڑی خموشی سے مر گیا۔

اسلم مر بھی سکتا تھا؟ شبنم یا سائمن پر کیا گزری ہوگی؟ ۔ میری آنکھیں جلنے لگیں، اور میرا جی چاہا کہ سائمن سے مل کر اسلم کی بہت سی باتیں کروں، اسلم جو میرا دوست نہیں تھا، پھر بھی اس کے دکھوں اس کی مسکراہٹوں اور اس کی خوشیوں نے میرے دل میں اس کے لیے ایک مخصوص جگہ بنا دی تھی۔

اسلم کی زندگی کا باب ختم ہو گیا، دنیا کی سب سے آخری تہہ خانے میں وہ کتاب ہمیشہ کے لیے بند کی جا چکی ہے میں نے اپنے منتشر ذہن کو پرسکون کرنا چاہا مگر یادوں کے نقوش آہستہ آہستہ ہی دھندلے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیے اپنی ملازمت کی فکر اور جد و جہد میں مشغول ہی تھا کہ مجھے ٹائیفیڈ ہو گیا۔ گھر والوں نے گھبرا کر ہوسپٹل کے کوٹیج میں داخل کر دیا، جب طبیعت ذرا سنبھلی تو میں نے اپنے کمرے اور آس پاس کا جائزہ لیا، آنے جانے والوں میں بھی دلچسپی لینی شروع کی۔

برآمدے اور لان میں کچھ چلتے پھرتے مریض بڑے خوش نظر آتے تھے، اتنے دنوں کے بعد سبزے پر دھوپ کی سنہری کرنوں کو دیکھ کر جی کھل اٹھا تھا، بہار آنے والی تھی، درختوں کے ہلکے زرد ہوتے ہوئے پتوں پر لرزہ سا آ گیا تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے تختے اپنے حسن و شباب پر مست دیے خود ہو کر

جھوم رہے تھے۔ آہستہ آہستہ آنے والے موسم بہار کی دلکش ہوائیں چلنے لگی تھیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک پرمسرت رنگین وحسین بہار بیتنے والی تھی۔ یہی ملا جلا ہوا موسم ہمارے دلیش کا حسن تھا، ہماری اپنی دنیا کی جنت تھا، ہم انہی پیاری رتوں میں بستے چلے آرہے تھے۔ خوشیوں اور مسرتوں کے ترانے گاتے جا رہے تھے۔

میں کئی تکیوں کے سہارے بیٹھا دور ہی دور سے مسرور ہو رہا تھا کہ یک بیک وقت میری نظر پروفیسر سراج پر پڑ گئی۔ دو لڑکوں کے سہارے بیچ میں وہ لڑکھڑاتی ہوئی چال سے چل رہے تھے۔ پتہ نہیں انھیں کیا ہوا تھا۔ وہ اسی طرف گنگا کے کنارے ایک کرسی پر بٹھا دیے گئے تھے۔ میرے پیروں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں قریب جا کر ان کی مزاج پرسی کرتا۔ کئی دنوں کے بعد پروفیسر سراج کی تیمارداری کرنے والا لڑکا میرے کمرے میں آکر بولا۔ اگر آپ ڈاکٹر فیضر ہیں تو پروفیسر صاحب آپ سے ملنے کو آنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر سراج کو آنکھوں کی روشنی سے محروم دوسروں کے سہارے، بہکی بہکی چالوں سے چلتے ہوئے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" میں نے بڑے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ میری مٹھاس پسند طبیعت کی دین ہے" انھوں نے بڑی بے بس مسکراہٹ سے کہا۔ ان کے چہرے، لب ولہجہ اور باتوں کے ہر ایک انداز پر ان کے اندھے پن کی چھاپ صاف نظر آرہی تھی۔

"شوگر سے دو بار مرتے مرتے بچا ہوں۔ اور اب آنکھوں کی پتلیوں پر شوگر کی وجہ سے خون جم کر رہ گیا ہے۔ ان خونی پردوں کے پیچھے کوئی ایسی دراریں نہیں ہیں جن سے میں اپنی دیکھی بھالی دنیا کو پھر سے دیکھ سکوں۔ ایک مستقل

اندھیرا چھا کر رہ گیا ہے۔ مہینوں بیت گئے ساری دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ طبیعت بہت گھبرا جاتی ہے۔ تب افسانے سننے لگتا ہوں۔ شاعری کے سرور میں اپنے آپ کو بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں ——— پھر جب ان سب سے بھی جی اوب جاتا ہے تو لڑکوں کو ڈکٹیشن دینے لگتا ہوں، بچارے لڑکے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ ابھی سنا کر آپ اسی ہوسٹل میں میرے کمرے کے قریب ہیں تو دیکھیے آپ کی آواز سننے کو آ گیا ہوں۔ بس یہی گنے چنے لمحے اب میری زندگی بن کر رہ گئے ہیں۔"

ہوسٹل میں تیمار داری کرنا جتنا آسان ہے بیمار بن کر رہنا اتنا ہی مشکل ——— میں کمرے کی محدود فضا میں گھٹ گھٹ کر اپنی صحت کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، پیروں میں ابھی تک کمزوری باقی تھی، پھر بھی میں نے اپنے ملازم کے سہارے، دیواروں اور دروازوں کو تھامتے ہوئے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے کمرے کی قید تنہائی سے آزاد کر لیا تھا، لوگ ملنے ملانے کو آ جاتے اور مجھ کو بہتر پا کر خوش ہوتے ہوئے چلے جاتے۔ زیادہ پڑھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ پروفیسر سراج کی آنکھوں کا حال دیکھ کر دل اور کانپ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے جب چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو سب سے پہلے پروفیسر کے کمرے میں چلا گیا، وہ بچارے اپنے بستر پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے، قریب ہی میز پر ٹرانزسٹر رکھا ہوا تھا، وہ میری آہٹ پر چونکے۔

"میں قیصر ہوں۔ کہیے کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

وہ بڑی مجبور سی ہنسی ہنس پڑے۔ "اپنی تاریک زندگی کی اب کچھ عادت سی پڑ گئی ہے"۔ پھر ہم ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئے۔ اچانک میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس آہستہ سے گونج اٹھی، اس کے ساتھ ہی پروفیسر سراج کے لبوں پر

ایک زندہ مسکراہٹ کوند اٹھی - دن کے بارہ بجے، الارم بجتے ہی پروفیسر کی مسکراہٹوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کمرے کا پردہ ہلا اور ایک دبلی تپلی سی لڑکی ساڑھی کے اوپر کالی شال اوڑھے دبے دبے قدموں سے آکر مسہری کی اوٹ میں بیٹھ کر سیب چھیلنے لگی تھی - پروفیسر کا چھوٹا بھائی بھی اسی وقت دوائیں اور پھل لے کر آگیا تھا - پروفیسر سراج کی جاندار مسکراہٹوں کو دیکھ کر میں پہلے ہی چونک گیا تھا - پروفیسر سراج خاموشی کے ان لمحوں کو محسوس کرتے ہوئے اچانک کھکھلا کر ہنس پڑے۔ "ڈاکٹر قیصر! یہ لڑکی صرف میری نرس نہیں ہے، میری بڑی مخلص دوست بھی ہے اور اس تاریکی میں اب یہ میری آنکھوں کی روشنی بن چکی ہے"، کالی شال سے ڈھکی ہوئی لڑکی نے مسہری کی اوٹ سے اٹھ کر ترشے ہوئے سیب کی پلیٹ جب سراج کے ہاتھوں میں تھمائی، تب میں اسے دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ اتنے دنوں کے بعد سائمن میرے سامنے کھڑی تھی، وہی بدن وہی قد و قامت، چہرے پر وہی ٹھہرا ہوا سکون اور آنکھوں میں وہی عزم، میں دم بخود رہ گیا۔ اچانک اسلم کی یاد مجھے تڑپا گئی - پروفیسر کہنے لگے۔ "میں تو چند مہینوں سے اپنی آنکھوں سے محروم ہو چکا ہوں۔ مگر اس لڑکی سائمن نے اپنی مہرباں آواز کی لچک اور خلوص کی گرمی سے میری روح میں روشنی سی بھر دی ہے، اس لڑکی کی خدمت گزار لمبی لمبی انگلیاں ایک آرٹسٹ کی انگلیاں ہیں، ریڈیو پر اس کے فیچر بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں، ہواؤں میں بسی ہوئی خوشبوئیں اس کے نغموں میں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ سائمن کی آنکھوں میں پیار و محبت کے کتنے چراغ جلتے ہیں، میں تو اس لڑکی کی مسکراہٹوں کو بھی نہیں دیکھ سکا ہوں، صرف محسوس ہی کرتا رہا ہوں، جس طرح ایک سنگ تراش اپنے تراشے ہوئے بت کے خاموش لبوں کو دیکھ تو

سکتا ہے مگر اس کی دلکش آواز سُن نہیں پاتا، اسی طرح میں بھی سائمن کی خوبصورت آواز اس کی بہتے ہوئے آبشار جیسی بے اختیار ہنسی اور اس کی پرفسوں گنگناہٹوں کو سنتا رہتا ہوں، وہ سارے محسوسات دل کی گہرائیوں میں جذب تو ہو جاتے ہیں، پھر بھی میں اس لڑکی کو دیکھ نہیں سکتا۔ یہ میری زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے، جب میں اس تاریک دنیا سے گھبرا جاتا ہوں اور ڈاکٹروں کی یقین دہانی کے باوجود ایسی ناکارہ زندگی سے موت کی تمنا ہونے لگتی ہے تو اس وقت سائمن ایک فرشتے کی طرح مجھے تسکین دیتی ہے کہ میری پتلیوں پر جما ہوا سلاخون آپریشن سے نکال دیا جائے گا، پھر میں پہلے جیسا بن جاؤں گا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کو بڑی جادوگری آتی ہے۔ میں تو اس کے قدموں کی آواز بہت دور سے سُن لیتا ہوں۔"

میں بجھا بجھا سا اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ یہ سائمن سچ مچ کی ساحری کرتی ہے، کسی کی زندگی کی گرتی ہوئی چھت کو اپنے پیار و محبت کی تھپکیاں دے کر سنبھالا دیتی ہے اور جب وہ چھت اس سہارے کو پا کر بھی گر جاتی ہے تو وہ مایوس نہیں ہوتی اسی تر و تازگی کے ساتھ وہ پھر کہیں نہ کہیں سہارا دیتی نظر آجاتی ہے، کیا سائمن کے دل میں بیتے ہوئے لمحوں کا کوئی درد نہیں ہوتا؟ اس کی آنکھیں اسلم کو کیسے بھلا سکی ہوں گی؟ اس کی سانولی بھولی صورت میں کیسا بے حس دل تھا؟ کیا وہ سچ مچ مجبور زندگیوں سے صرف کھیلنا ہی جانتی تھی، کسی بے بس مریض کے خونِ جگر سے اپنی انگلیوں کو رنگ لینے میں اس کو کیا مزہ ملتا ہوگا؟ شاید اپنی تعریف سُنے بغیر اس کے لیے زندہ رہنا مشکل تھا۔ وہ تو ایک ایسے مقام پر کھڑی نظر آرہی تھی جس کے گرد تماشے ہی تماشے تھے، کہانی وہی تھی صرف ہیرو بدل گئے تھے۔

مگر یہ پردے کب تک اسی طرح سے اٹھتے گرتے رہیں گے؟ میں نے سوچا یہ
لڑکی جو سائن تھی وہ کبھی شبنم نہ بن سکے گی، وہ سائن ہی رہے گی چاہے
اس کے جتنے بھی روپ کیوں نہ ہوں۔

کبھی کبھی میں پروفیسر کے کمرے میں اسی وقت جایا کرتا جب وہ اکیلا ہوتا
تھا، میز پر ٹائم پیس کا الارم بجنے سے پہلے میں واپس چلا آتا، میں سائن
سے ملنا یا اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس کی اداکاریاں میری آنکھوں میں
چبھنے لگی تھیں۔ سائن کے سارے انداز میرے الجھنوں کو بڑھا دیا کرتے تھے۔
کیا اس کی زندگی اور غموں سے یہ فرار کا ذریعہ تھا؟ - یا اسلم کی موت کا وہ بدلہ
لے رہی تھی۔ برآمدے اور باہر احاطے میں بیٹھا ہوا میں بڑی خموشی سے ڈیوٹی کے
بعد سائن کو پروفیسر کی خدمت میں لگی ہوئی دیکھتا رہتا تھا۔

پروفیسر سراج نے مجھ کو بتایا تھا کہ حکومت اپنے خرچ پر اس کو آنکھوں
کے آپریشن کے لیے لندن بھیج رہی ہے' وہ سائن کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا
تھا مگر اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔

ڈاکٹر نے مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی، ہوسپٹل سے جانے کے وقت
جب پروفیسر سے مل کر میں اس کو خدا حافظ کہنے گیا تو سائن بھی اسی جگہ تھی،
پروفیسر سراج نے ٹٹول کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا' وہ اس وقت بے حد
جذباتی ہو رہے تھے، معلوم نہیں کیوں سائن کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، میری
طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی، میں نے بڑی سخت دلی سے سائن کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

" شاید ہم پھر کبھی زندگی کے کسی موڑ پر اسی طرح اچانک مل جائیں گے۔
اس وقت تک کے لیے خدا حافظ"!

چند مہینوں کے بعد مجھے ریڈیو اسٹیشن میں ایک اچھی سی جگہ مل گئی تھی، اب کسی حد تک میں مطمئن تھا، اگرچہ میں علم و ادب اور شعر و نغمے کا پرستار تھا اور میری پیاسی روح اسی ذوق کی طلبگار تھی، پھر بھی اتنی اچھی جگہ کا مل جانا میری خوش نصیبی تھی۔

ایک دن مجھے ایک افسانے کی ریکارڈنگ کرانی تھی، میٹنگ سے واپس آیا تو سوچا وقت ہو گیا ہے کام ختم کراتا جاؤں، میں نے دربان کو اپنے آفس بھیج کر افسانہ نگار صاحبہ کو بلا بھیجا، اور اناؤنسمنٹ روم میں جا کر ٹیپ ٹھیک کرنے لگا تھا کہ اچانک شیشے کے اس پار دوسرے کمرے کی طرف میری نگاہ اٹھیں۔ سائمن میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنی کہانی کے ورقوں سے پن نکال رہی تھی۔ "خدایا۔! میں اس لڑکی سے کہاں کہاں ٹکراتا پھر رہا ہوں" میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور میرا چہرہ آپ ہی آپ سرخ ہو گیا۔ کہانی کیا تھی؟ کیسی تھی میں نہیں جانتا۔ میری آنکھوں میں تو اسلم کی مسکراتی ہوئی صورت نظر آ رہی تھی، اور سائمن کی آواز کا لوچ، نرمی اور اس کے پیار و محبت پر جھوم جھوم اٹھنے والے پروفیسر کی تشنگی کا درد مجھے تڑپا رہا تھا۔ کہانی ختم ہو چکی تھی، میں نہ چاہتے ہوئے بھی سائمن کے پاس اسٹوڈیو میں چلا گیا۔

"آپ کہانیاں بھی لکھ لیتی ہیں؟"

اس نے ڈری ڈری نگاہوں سے مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا "معاف کیجیے گا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ یہاں ہوں گے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو مجھے دیکھ کر افسوس ہو رہا ہو گا۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ آپ چند لمحوں کے لیے میری اپنی کہانی سن لیں۔" میرے ساتھ زینہ سے اترتی ہوئی میرے کہنے پر وہ احاطے کے ایک طرف پارک کے ایک کنارے میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ آج اس کے لبوں پر

مسکراہٹ نہیں تھی آنکھیں ویران سی ہو رہی تھیں بھرے پر دکھوں کی پرچھائیں تھیں، میں نے سائمن کو اس حال میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ سائمن نے ہلکے سے میری طرف دیکھا "قیصر صاحب! پلیز میری اپنی کہانی سن لیں" میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں اور وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

"— میرا بچپن پیٹر کے ساتھ ہنستے کھیلتے گذرا تھا۔ ہم دونوں ٹوٹ کر ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے۔ جس دن ہمارے باپ نے چرچ لے جا کر ہماری شادی کرائی تھی، وہ بڑا خوبصورت دن تھا، سفید گاؤن پہنے رنگا رنگ پھولوں کے ڈھیروں گلدستے لیے ہم نے ایک دوسرے سے زندگی بھر محبت کرنے کی قسم کھائی تھی، مگر دو ہی سال میں پیٹر بخار میں جلتا سیروں لال لال خون اگلتا میری گود میں سر رکھے بڑی بے بسی سے مر گیا۔ پیٹر نے بڑے پیار سے میرا نام سائمن رکھا تھا، بس یہی اک نام میرے پاس اس کی یادگار رہ گیا ہے۔ میں نے اپنے کو بھلانے کے لیے نرسنگ کی ٹریننگ لے لی، میری پہلی ڈیوٹی ٹی۔ بی سنٹر میں لگی تھی جہاں میں نے پہلی بار اسلم کو دیکھا تھا اور اسی وقت اچانک مجھ کو پیٹر یاد آ گیا۔ میں نے اسلم کی خدمت نہیں کی تھی، میں نے اس کو اپنی آنکھیں بند کر کے پیٹر سمجھ لیا تھا۔ میرا پیٹر! جو دواؤں کے بغیر مر گیا تھا۔ شادی کے دن چرچ میں کھائی ہوئی قسم میں بھلا نہ سکی تھی، ویسے ہی بخار میں انگارہ بنی ہوئی صورت اسی طرح جینے کی تمنا — میں نے روپ بدلے ہوئے پیٹر کی ساری حسرتوں کو پورا کر دیا۔ مگر لال لال خون کے تھکے ہوئے میرے پیٹر کو اس دفعہ بھی مجھ سے چھین کر لے گئے۔ — پیٹر نے پہلا نام مجھے سائمن کا دیا تھا اور اس کے دوسرے روپ نے مجھ کو شبنم بنا دیا۔ میری زندگی کا ہر ایک لمحہ پیٹر اور صرف پیٹر کے نام پر خدمت کیے جانے میں گذر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر ایک مجبور انسان کی خدمت میں ڈوب

گئی جو میرے وجود کے احساس سے اپنے غموں کو بھول کر میرے انتظار کی لذتوں سے سرشار رہنے لگا تھا اور اس کی یہی تھوڑی سی خوشی میرے دکھے ہوئے دل کے لیے سکون اور قرار بن گئی تھی، دوہری چوٹ کھانے کے بعد بھی میرے اندر تھوڑی سی ہمت باقی رہ گئی تھی، میں نے ہر رات سونے سے پہلے صلیب ہاتھ میں لے کر اپنے پیٹر کو اپنی محبت کا یقین دلایا ہے، میں اپنے دل کی گہرائیوں کو ناپتی رہی ہوں میری روح کے پیار بھرے اتھاہ سمندر کا ایک ایک قطرہ میرے پیٹر کی محبت کا گواہ ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی میں اس بات کا بھی اقرار کروں گی کہ جس طرح مجھے سائمن کے نام سے محبت ہے اسی طرح شبنم سے بھی پیار ہے۔ اور اب؟ اب میں بے نام ہوں۔ میرا اپنا نام بہت پہلے کھو چکا ہے اور پروفیسر سراج نے لندن جاتے ہوئے مجھ کو کوئی نام نہیں دیا۔

اب میں بہت تھک گئی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تپتے ہوئے صحرا میں جلتی، تڑپتی اور ٹوٹتی ہوئی ایک ذرے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں۔ مگر ـ! مگر ـ! میری اس تشنہ لبی کو کون جانے؟؟

— —

منگلاہاٹ کی راجکماری

سورج مُنی کے خوبصورت قد و قامت گیندے کے پھولوں کی طرح دمکتے ہوئے رنگ اور ترشے ہوئے جسم کو دیکھ کر کوئی بھی اس کو آدی باسی لڑکی سمجھ نہیں سکتا تھا، اتھلی آنکھوں میں غضب کی کشش تھی بات بات پر اس کو بے اختیار ہنسی آجاتی اور جب بھی وہ ہنستی اس کے داہنے گال کی موہنی کا حُسن ایک بھرے ہوئے پیمانے کی طرح چھلک چھلک پڑتا تھا۔ اس کو اپنی خوبصورتی کا شدید احساس تھا اس کے جسم پر کَسی ہوئی ساڑی اس کے سراپا کو ایک شاعر کے تخیل میں ڈھال دیتی تھی —— جب وہ پہلی بار میرے پاس گھر کے کام کے لیے لائی گئی تو میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عمر خیام کی ایک جیتی جاگتی رباعی میرے پاس شرمائی لجائی سی کھڑی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی — آنکھوں میں کاجل کی پھیلی ہوئی بدلیاں تھیں، بالوں میں پھولوں کی کلیاں اور چہرے پر البیلی مسکراہٹیں تھوڑے شکن تھیں پھر یہی ساری چیزیں بہ ملکر سورج مُنی بن گئی تھیں اور وہ اس وقت میرے سامنے کھڑی تھی۔ سورج مُنی کو میرے پاس کام دلانے کے جو آدمی لایا تھا وہ بڑے ادب سے بولا۔ سلام گملے۔ یہ لڑکی بڑا اچھا کام کرے گی۔ باپ کے مرنے سے آج کام پر نکلی ہے۔ اپنا کوئی نہیں بس منگلاہاٹ کے دن چھٹی مل جائے کو چاہیئے —— ہم آدی باسی لوگ

ہاٹ میں ناچتا ہے گاتا ہے۔ ہنڑیا پیتا ہے اور پھر اپنا سب دکھ درد بھول جاتا ہے۔ مالکن ہجور۔ یہ لڑکی منگلا ہاٹ کی راج کماری ہے۔ ہاں مالکن۔ ہم سب بولتا کہ یہ منگلا ہاٹ کا جیون ہے!"

اور اس طرح منگلا ہاٹ کی راج کماری میرے یہاں کام کرنے لگی تھی، اس کا کام بڑی صفائی اور ستھرائی سے ہوا کرتا تھا اس کے ہاتھوں کی تھرکن اور اٹھتے ہوئے قدموں میں نغمے بھرے ہوئے تھے۔ کھیل ہی کھیل میں وہ اپنے سارے کام ختم کر لیتی ــــ اس نے آتے ہی میرے گھر کو گڑیا کی طرح سجا دیا تھا۔ یہ آدی باسی لڑکی اور اتنا اونچا مذاق میں حیرت بھری نگاہوں سے اسے بس تکتی رہ جاتی تھی ــــ وہ کوئی اپسرا تھی جس نے ایک غلط گھر میں جنم لے لیا تھا۔ منگلا ہاٹ کے دن وہ بہت سویرے اٹھ جاتی، جلدی جلدی سارے کاموں سے نپٹ کر اپنے آپ کو سجانے میں لگ جاتی، ایک دن پہلے سے وہ اپنے کپڑوں پر استری کر لیتی رنگ برنگے موتیوں کے مالے پہنتی، پیروں میں گھنگرو باندھتی، بالوں کے جوڑے میں پھولوں کی بینی سجاتی ــــ ہاتھوں میں موتی اور پھولوں کے کنگن باندھتی اور اپنی مدھ ماتی آنکھوں میں کاجل کی لکیریں پھیر کر ان کو اور قاتل بناتی۔ پھر ایسی سج دھج سے اپنے ہفتہ بھر کا روپیہ مجھ سے لیتی اور دھیمے سروں میں گنگناتی ہوئی میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ــــ سورج مکھی کے چلے جانے سے گھر میں اداسی چھا جاتی تھی ــــ جیسے سچ مچ سورج کے چھپ جانے سے تاریکی چھا جاتی ہے۔ منگلا ہاٹ شہر سے کچھ دور پر لگتا تھا، دوپہر ہوتے ہوتے ہاٹ آدمیوں اور چیزوں سے بھر جاتا ــــ یہ ہاٹ آدی باسی لوگوں کی تفریح گاہ ہوا کرتی ہیں۔ ہاٹ کے اندر مرغوں کی لڑائیاں ایک ضروری چیز ہوتی ہیں۔ شام ہوتے ہوتے منگلا ہاٹ کی رونقیں بڑھتی چلی جاتیں ہنڑیا پیتے پیتے آدی

باسی نشے میں چور ہو جاتے۔ ڈھول کی آواز بہت دور تک سنائی دیتی اور کبھی کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ آدی باسی گاؤں کی ملی جلی گونجیں بھی ہمارے کانوں تک آجاتی تھیں۔ اور اسی لہر کے ساتھ میری نگاہوں میں سورج منی کا سراپا جھلک پڑتا تھا — جو ایک اپسرا کی طرح اپنے ہی نشے میں مست اپنے انگ انگ سے پھوٹتے ہوئے نغموں کی تال پر ناچ رہی تھی۔ جھوم رہی تھی اور ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے کانپ رہی تھی — رات کی تاریکیاں جیسے جیسے گہری ہوتی چلی جاتیں ہاٹوں کی رونقیں عروج پر پہنچ جاتی تھیں۔ آدی باسی نوجوان لڑکے اپنے بالوں کو پھولوں اور اپنے ننگے ارمان بھرے سینوں کو موتیوں کے مالاؤں سے سجائے ہوئے اپنے ناچ میں مست ہوتے پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں ایک لمبے دائرے میں ایک ساتھ ناچنے لگتیں۔ ہنڑیا کا نشہ ان کے نس نس میں شرارے بھر دیتا زمین اور آسمان — ان کے ساتھ محو رقص ہوتے — اور ڈھول کے اونچے اور نیچے سُر دھماتے نغموں کے بول ان کو دُور بہت دُور اپسراؤں کے کسی دیس میں پہنچا دیتے تھے۔ اور جب دھیرے دھیرے رات کا جادو ختم ہو جاتا تو پھر سارا نشہ ٹوٹ جاتا اور ان کی تھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے پھر وہی دنیا آجاتی تھی۔ وہ اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو مشکلوں سے سنبھالتے اداس قدموں کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ پڑتے۔ سورج منی بھی تھکی تھکی افسردہ سی لوٹ آتی، رات بھر جاگتے رہنے سے اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا ہوا لگتا، اور وہ نڈھال سی آکر بے خبر سو جاتی — سوتی ہوئی وہ بڑی پیاری نظر آتی جیسے سہاگ رات کی جاگی ہوئی دلھن باسی پھولوں کی خوشبوؤں میں بسی سو رہی ہو۔

سورج منی کی ساری تنخواہ ہفتہ کے ہفتہ منگلا ہاٹ کی نذر ہو جاتی تھی

وہ پیسہ بچا کر نہیں لاتی - ہنس کر صرف اتنا ہی بتا دیتی کہ ہاٹ میں سارے روپیوں کا اس نے ہنڈیا پیا اور دوستوں کو پلا دیا ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنے سنگار کی کوئی چیز بھی خرید کر لے آتی تھی ـــــ اسی طرح سے ہنستی مسکراتی وہ زیادہ سے زیادہ نکھرتی چلی جا رہی تھی ـــــ اس کے قدموں میں رقص کے انداز بڑے بے خود ہوتے جا رہے تھے ـــــ جب بھی اس کو فرصت ملتی وہ پھولوں کے رنگ برنگے مالے گوندھنے لگتی - ایک بار میں نے اس سے پوچھا "سورج منی -! پھولوں کے اتنے مالے تم گوندھ کر کیا کرو گی" ـــــ میری باتوں کو سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ـــــ "ہم بیاہ کرے گی مالکن - پھول مالا کا شگن بناتی ہے دیکھو نہ! ابھی تک شگن نہیں بنا ـــــ پھول پر بھونرا آتا ہے نا؟ مگر ـــــ یہاں کوئی بھونرا نہیں آتا۔ سب کا سب منگلاہاٹ پر میرے پیسے سے ہنڈیا پی جاتا ہے۔ اور یہاں شگن بنانے نہیں آتا ـــــ!"

سورج منی کے چہرے کی تمتماہٹ بڑھتی چلی گئی اور اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے پھولوں کے مالا گوندھتی رہیں - وہ منگلاہاٹ جاتی رہی - اور دوسرے دن لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس آجاتی ـــــ مگر اب وہ اکھڑی اکھڑی سی رہنے لگی تھی، جیسے اب اس گھر سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا ہو۔ خود ہی کہتی ـــــ مالکن اپنا من کرے ہے ناچتے ناچتے دھرتی سے آکاش پر چلی جائے - اپنا شگن دھرتی پر نہیں لگتا! ـــــ اب ہم چندرما پر جائے گی! اتنا کہہ کر اس کے لبوں سے ہنسی کے فوارے چھوٹ پڑتے - اور میں اس کی اس بدلی ہوئی حالت سے پریشان ہو جاتی کہ نہ جانے کب یہ چندرما پر اپنے شگن کی کھوج میں نکل جائے گی - اس لڑکی کے آجانے سے میرے گھر میں کام کی بڑی سہولت ہو گئی تھی، وہ اپنا سارا کام ختم کر کے میرے پاس آجاتی گھر کے کسی

ملازم سے اس کی نہیں بنتی تھی ــــ وہ کسی کو منہ ہی نہیں لگاتی، اس کے سپنوں کا راجہ تو کسی ایسے سنگھاسن پر براجمان تھا کہ سورج منی کی ساری تپسیا ئیں اب تک اس کو سورج منی کے قریب نہیں لا سکی تھیں۔ اور بیچاری سورج منی تھی کہ برہ کی آگ میں جلتی چلی جا رہی تھی۔

سورج منی نے منگلا ہاٹ کے دن اپنی سب سے اچھی ساڑی پہنی اور سج بجا کر جب میرے پاس پیسے لینے آئی تو میں اس کا ساج سنگار اور اس کے نکھرتے ہوئے حسن کو دیکھ کر چونک پڑی۔ سورج منی آج چوتھی کی دھن کی طرح سجی شرمائی ہوئی کھڑی تھی۔

وہ اسی طرح گنگناتی چلی گئی ــــ اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کی آہٹیں بہت دیر تک میرے ذہن میں آتی رہی تھیں۔ ساری سات آدی باسی گاؤں کی لہراتی ہوئی آوازیں ڈھول کے تھاپوں کے ساتھ گونجتی رہیں اور سورج منی کا لہراتا ہوا جسم میری آنکھوں کے آگے ناچتا رہا ــــ صبح کا سورج جاگ اٹھا تھا۔ دھوپ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی لیکن سورج منی واپس نہ آئی۔ میں نے کئی بار گیٹ تک جا کر دیکھا دور دور تک نگاہیں دوڑائیں۔ مگر سورج منی کا کہیں نشان نہ تھا ــــ میرا دل اداس ہو گیا ــــ آخر وہ لڑکی چندرما پر اپنا شگن لانے چلی گئی۔

دن بیتتے چلے گئے سورج منی کی صرف ایک یاد باقی رہ گئی تھی ــــ رات کے سناٹے میں منگلا ہاٹ سے جب کبھی ڈھول کی آوازیں اور گانوں کی اٹھتی اور ڈوبتی ہوئی لہریں سنائی دیتیں تو بے اختیار مجھے سورج منی یاد آجاتی ــــ جس کے جوڑ جوڑ اور بند بند میں شراب چھلکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ــــ ہنڑیا پی کر نشے کے عالم میں اس کا کیا حال ہوا کرتا ہوگا۔

اڑتی پڑتی خبریں آنے لگی تھیں کہ سورج منی سے ایک بہت پیسے والے آدی باسی نے بیاہ کر لیا ہے اب وہ پھولوں سے زیادہ چاندی کے اجلے گہنوں سے لدی رہتی ہے ۔ اس کے جسم پر خوبصورت ساڑیاں جھلکتی رہتی ہیں ۔ وہ بہت خوش ہے بڑے اچھے گھر میں رہتی ہے ۔ اور اب وہ منگلا ہاٹ میں نظر بھی نہیں آتی ——

دوسرے ہی مہینے اچانک لٹی لٹائی سی سورج منی میرے پاس آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ میں نے اس لڑکی کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے مگر اس وقت وہ میرے پاس سسک رہی تھی ۔ مجھ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی سورج منی ہے ، جس کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی تھی بکھرے ہوئے بال ، میلی ساڑی پسینے کی بساند سے بھری وہ سسکتی چلی جا رہی تھی —— میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو جھنجھوڑا ۔

" سورج منی ! ارے تو نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے ؟ وہ تیرے سارے زیور ۔ اور ریشمی ساڑیاں کیا ہوئیں ؟ سورج منی میری باتیں سن کر پھوٹ پڑی ——

" مالکن ! —— وہ سب چیز ہم چھوڑ کر آ گئی —— ایک ایک گہنا ہم اس کے منھ پر پھینک پھینک کر مارا ۔ سُور کا بچہ گہنا پہنا کر ہم کو تین بار منگلا ہاٹ جانے نہیں دیا ۔ کوٹھری میں تالا لگا کر بڑھا منگلا ہاٹ چلا جاتا تھا اور ہم کو رسّی میں باندھ کر رکھتا —— مالکن ہم منگلا ہاٹ کے بنا جی نہیں سکتی ۔ اور اُو اپنا گہنا ساڑی دے کے ہم کو مول لیتا تھا —— ہم بکنے نہیں سکتی تھی ۔ مالکن —— منگلا ہاٹ ہمارا جیون ہے —— اب ہم منگلا ہاٹ جا سکتی ہے —— ہنس بول سکتی ہے —— سب کچھ کرے گی ناچے گی ۔ ہنڑیا پیے

گی رات بھر جاگے گی۔ اب ہم کبھی گھٹا نہیں پہنے گی ۔۔۔ ! مالکن اب ہم کبھی گھٹا نہیں پہنے گی ۔۔۔" سورج منی کی آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو رہی تھیں، مگر اس کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

--

جلتے ہوئے البم

پتہ نہیں میں کیسے ایک عرصے کے بعد اچانک فیض بھائی سے ملنے چلی گئی۔ جیسے ہی احاطے کے گیٹ میں داخل ہوئی تو ایک عجیب سی بو ہلکے ہلکے دھوئیں کے ساتھ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی سنسان پڑی تھی۔

"کیا چیز جل رہی ہے؟" میں اٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف بڑھی۔ فیض بھائی ایک کنارے آرام کرسی پر آدھے لیٹے ہوئے شاید ویکلی پڑھنے میں غرق تھے، صبیّ اٹھتے ہوئے دھوئیں اور ٹھہر ٹھہر کر لپکتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھی کچھ جلا رہی تھی۔

"ارے! اس گرمی میں تم آگ جلائے بیٹھی ہو"؟ میں حیران ہوتی ہوئی اس کے اور قریب آ گئی۔ اچانک بھڑکتے ہوئے شعلوں میں میری نگاہیں ادھ جلی ہوئی جلدوں پر جم کر رہ گئیں، سفید، بھورے اور سیاہ رنگ کے یہ جانے پہچانے ہوئے البم تیزی سے جلتے جا رہے تھے، شعلہ بھڑکا اور میری آنکھوں کے سامنے "سنہ ۴۱ء سے سنہ ۴۲ء تک" لکھے ہوئے خوبصورت موٹے موٹے حروف جلنے کے بعد بھی اکڑے ہوئے نمایاں طور پر جھلک رہے تھے۔ سنہ ۴۳ء سے سنہ ۴۴ء تک لکھا ہوا البم کا وہ حصّہ چنگاریوں میں الجھا ہوا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ صبیّ نے لکڑی کے سرے سے جلتی ہوئی آگ کریدی۔

چند تصویریں، شعلوں میں بکھر گئیں۔ صبی باجی کی خوبصورت آنکھیں آگ کے شعلے میں جلتی نظر آئیں، میں کانپ اٹھی۔ خدایا۔! مجھے ایسا منظر بھی دیکھنا تھا؟ اب آخری البم لہک رہا تھا۔ ۷۵ء کی ساری یادگار تصویروں کو اپنی آغوش میں لیے سفید البم تیزی سے جلتا چلا گیا۔ ساری تصویریں جل کر راکھ بنتی جارہی تھیں۔ جلی ہوئی کچھ تصویریں اب تک اکڑی پڑی تھیں۔ سارے نقوش مٹ چکے تھے۔ ساری یادوں کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ صبی میرے اچانک آجانے پر کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ فیض بھائی اب تک بڑی خموشی اور لاپرواہی کے ساتھ ویکلی پڑھ رہے تھے۔

میں اپنے آپ پر حیران تھی کہ اس غم ناک نظارے کو دیکھنے کے لیے خواہ مخواہ کہاں سے آ ٹپکی تھی۔

صبی نے ہر طرف چھائی ہوئی خموشی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی شرمندگی مٹانی چاہی " شینو! میں اپنی نئی زندگی کا خیر مقدم کرنے کے لیے اپنی راہ سے سارے کانٹے ہٹا رہی ہوں۔ دیکھو صبح کی یہ حسین لالی میں دھیرے دھیرے نکلتا ہوا آفتاب ہماری مسرتوں بھری دنیا کو روشن کر رہا ہے "

" اور اسی لیے تم ان خوبصورت لمحوں میں اتنا بے درد تماشا کر رہی ہو۔؟" میں نے بجید جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

" شینو! یہ ساری چیزیں ہماری خوشیوں کے راستے میں حائل ہو جاتیں تو پھر میں کیا کر سکتی تھی؟ "

" کسی کی سسکتی ہوئی آہیں جب ناکامیوں کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہیں تو اسی طرح سے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے نہیں جاتے صبی۔ بڑا اچھا ہوتا اگر تصویروں کی اس چتا پر دوسری ناکام محبت کی یادگاریں بھی

جلاکر خاک کر دی جاتیں "۔

حبی نے تڑپ کر بڑی غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ فیض بھائی نے بھی دیکھی رکھ کر بڑی مجبور نگاہیں مجھ پہ ڈالیں۔ شاید میرے لہجے کی کاٹ انھوں نے محسوس کر لی تھی۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس جہنم سے جلد سے جلد نکل بھاگوں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو رہی تھیں اور ضبط کرنے کی وجہ سے میری سانس ناہموار چلنے لگی تھی" الہٰی! میں یہ سویرے ہی سویرے گرمی سے بدحواس ہو کر سیر کرنے کے بجائے یہاں۔ اس گھر میں کیوں آگئی تھی؟۔ کیا یہ کسی قسم کی ٹیلی پیتھی تھی؟ جو میں اس لرزا دینے والے نظارے کو دیکھنے آگئی تھی؟

میں بوجھل قدموں اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ پتہ نہیں کیسے راستہ طے کرتی گھر پہونچ گئی۔ کسی طرح سے میں نے اپنے آپ کو صوفے پر گرادیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی"۔ حبی باجی! آج آپ کی ساری یادگار تصویریں آپ کے اپنے چہیتے فیض کے سامنے جلاکر خاک کر دی گئیں۔ آپ کی ہنستی مسکراتی قہقہے لگاتی فیض بھائی کے ساتھ ان کی محبتوں میں ڈوبی ہوئی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے جلادی گئیں پانچ سال کی آپ کی خوشیوں مسرتوں اور بیتابانہ محبتوں میں سرشار لمحوں کی یادگاریں آگ کے شعلوں میں مٹ کر رہ گئیں۔ اور۔! اور میں کچھ نہ کرسکی۔ کچھ بھی نہ کر سکی"۔

اُبلتے ہوئے آنسوؤں کے پردے پر حبی باجی کا بھولا بھالا خوبصورت چہرہ جھلک اٹھا۔ باجی نے فیض بھائی سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ فیض بھائی بھی حبی باجی کو دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔ میں حبی باجی سے بہت چھوٹی تھی۔ لیکن اتنی سی عمر میں نگاہوں کی پہچان رکھتی تھی۔ کئی بار باجی نے

مجھ سے کہا تھا۔ شینو گڑیا۔ یہ کتاب نیچے جا کر فیضی بھائی کو دے آؤ۔
اور جب اس کتاب کے اندر سے فیضی بھائی نے ایک لفافہ نکالا۔ تب میں
چونک پڑی "ہوں! باجی بڑی چالاک ہیں، اب میں کچھ بھی نہ لے جاؤں
گی، نہ تکیہ نہ کتاب۔!" جمی باجی کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی، وہ میرے چچا
کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اور فیضی بھائی ان کے ماموں کے بیٹے تھے۔ باجی جتنی
پیاری اور ہنسنے والی تھیں فیضی بھائی اتنے ہی رزرو تھے بس ایک دفعہ جو
گھور کر دیکھا تو اپنا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی وہ بہت اچھے بھی لگتے
تھے۔ بیسوں شعر زبان پر۔ بڑے پیارے پیارے اشعار۔ اتنے خوبصورت
جیسے کسی گلستاں سے حسین پھولوں کو چن چن کر اکٹھا کر لیا ہو۔ میں جب کبھی
ان سے شوخ ہو جاتی تو کہا کرتی "فیضی بھیا اپنی اتنی اچھی صورت کو غصے
کے پردے میں کیوں چھپا لیتے ہیں۔؟"

پھر کئی سال بیت گئے۔ باجی کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ میں بھی کچھ
سمجھ دار ہو چکی تھی۔ فیض بھائی ڈاکٹری پڑھ رہے تھے، ان کے خاندان کی
ایک اور لڑکی نے بھی ان پر کمند پھینکی تھی اور ان کی محبت کے گیت گانے
لگی تھی۔ کافی دنوں کے بعد جب باجی ہمارے گھر آئیں تو یہ ساری باتیں
انھوں نے بتائیں۔ اس لڑکی کے کئی خط بھی دکھائے۔ میں ان محبت ناموں
کو دیکھتے ہی جل اٹھی "باجی! اپنے ڈاکٹر کو سنبھالو۔ ورنہ وہ گیا
ہاتھ سے۔!"

"ارے شینو رانی! اتنی جلدی فیصلے نہ کیا کر۔ مجھے ان پر پورا
یقین ہے۔ میں تو ذرا بھی نہیں ڈرتی۔!"

پھر جلد ہی خاندان میں اچانک اس محبت کا راز فاش ہو گیا۔

سارے بزرگ برہم تھے - جو بات آج تک نہ ہوئی تھی - وہ ہو گئی -
بند کمرے میں مشورے ہوتے رہے ' لوگ کافی بھڑکے ہوئے تھے اور ان کا
فیصلہ یہی تھا کہ محبّت کے اس ڈرامے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے تاکہ خاندان
کی دوسری لڑکیاں پھر ایسا قدم نہ اٹھا سکیں - ! مگر نئی نسل کے بھائیوں نے
دونوں کی شادی کر دینے پر زور دیا تاکہ یہ بات خاندان سے باہر نہ نکلے - اور
آخر انہی لوگوں کی بات مان لی گئی - !

جمّی باجی کی شادی میں میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا' رنگ و
نکہت کی ساری بہاریں ہر طرف سے چھلکی پڑ رہی تھیں -

باجی کی شادی کا دن میرے لیے ایک یادگار دن بن کر رہ گیا تھا —
بھاری جوڑا پہنے ہوئے میں اترائی اترائی سی پھر رہی تھی - ابھی ادھر ابھی
ادھر - ! جمّی باجی دلھن بن کر بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں - ہرنیوں جیسی
حسین آنکھیں بند تھیں اور لبوں پر بڑا ہی دلفریب سا تبسّم چھایا ہوا تھا -
باجی کے سہرے کی خوبصورت لڑیاں ابھی تک مجھے یاد ہیں - اتنے خوبصورت
سہرے میں نے اب تک کہیں نہیں دیکھے - موتیوں کے سہرے کی لڑیاں تو
اتنی لمبی لمبی تھیں کہ جمّی باجی کی سہیلیوں نے انھیں اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا
تھا - ! شادی کی جب ساری رسمیں ہو چکیں ، تب سالیوں کی باری آئی ، میری
حیثیت سب سے نمایاں تھی - سالیوں نے ایک ہی بار آٹے کی بنائی گیندوں
سے دولھا پر حملہ کر دیا - پہلے تو بچارا دولھا گھبرا گیا پھر انہی گیندوں سے
سالیوں کی خوب پٹائی کر دی - میں سامنے تھی اب جو انھوں نے نشانہ لگا کر
میرے لبوں پر گیند مارنا شروع کیا تو پھر میں گھبرا اٹھی ۔ ہائے ! فیضی بھائی
توبہ ! کل میری صورت کیا ہو جائے گی ؟ لب تو زخمی ہو ہی چکے ہیں - اب وہ

پھول کر لٹک بھی جائیں گے"۔ اور میں دولھا، دلھن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ گئی۔!

جمی باجی اور فیضی بھائی کی جوڑی بہت ہی پیاری تھی۔ ان کی محبت کی مثال ہمیشہ کی جاتی تھی۔ فیض بھائی کی پڑھائی کا سلسلہ چل ہی رہا تھا۔ وہ ایک بار امتحان دے کر آئے تو بڑے بے چین بے چین سے تھے۔ باجی کو ہر وقت اپنے پاس ہی پاس رکھتے۔ کبھی کبھی بہت ہی سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگتے تھے میں ہمیشہ ان سے جھگڑا کرتی رہتی تھی۔ کبھی ڈر بھی لگتا تھا۔ مگر پہلے جیسی بات نہ رہی تھی۔ مجھ کو بھی وہ بہت عزیز رکھنے لگے تھے۔ اچھے اچھے اشعار جمع کرنے کا انھیں ہمیشہ سے بڑا شوق رہا تھا۔ ان کی دوسری ہابی تصویر کھینچنے کی تھی۔ جمی باجی کی ڈھیروں تصویریں انھوں نے اپنے ساتھ کھچوائی تھیں۔ ہر انداز میں باجی کے فوٹو لیتے رہتے تھے۔ البم سجانے کا بھی ان کو ایک جنون تھا، باجی کی شادی کے وقت سے لے کر جب بھی ان کو موقع ملتا کیمرہ لیے سر پر سوار۔ تصویروں کے نیچے اپنی خوبصورت تحریر میں بڑے پیارے پیارے اشعار لکھتے رہنے کا بھی انھیں بڑا حسین سلیقہ تھا۔ ایک دن البم سجاتے ہوئے بڑے غمگین لہجے میں بولے، "جمی! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر تم میری زندگی سے کہیں چلی جاؤ گی تو یہی تصویریں، یہی البم میری اجڑی ہوئی زندگی کا آخری سہارا بنیں گی"۔ باجی کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ "بس ایک ہی جگہ ہے جانے کی۔ مگر آپ تو ڈاکٹر ہیں، مجھے روک لیں گے"۔!

فیضی بھائی جب واپس چلے گئے تو ان کے جانے کے کئی دنوں بعد میری اور باجی کی نگاہیں ایک ہی ساتھ کمرے کی دیوار پر گئیں۔ پنسل سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔!

تسکینِ اضطراب کو آئے تھے ہم مگر
بیتابیوں کی روح کو بالیدہ کر چلے

باجی نے مجھ کو ذرا جذباتی ہوتے ہوئے دیکھ کو کہا "آؤ شینو! تمہیں کچھ فوٹو دکھاؤں۔" انھوں نے تصویروں کا لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "شینو! ہاں ذرا غور سے دیکھنا یہ ساری تصویریں فیضی بھائی ان کے دوستوں اور نرسوں کی تھیں۔ وہ لوگ کسی پکنک میں گئے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی بیزار نگاہوں سے انھیں دیکھا اور باجی سے چڑھ کر بولی "کس دل سے آپ ایسی تصویریں دیکھتی اور دوسروں کو دکھاتی رہتی ہیں۔ فیضی بھائی کے ساتھ یہ نرسیں کتنی شوخیاں کر رہی ہیں۔ آپ کو بڑا اچھا لگتا ہے؟"

باجی ہنس پڑیں "شینو! فیضی پر مجھے بہت اعتبار ہے۔ تم میرے دل کی گہرائیوں کو کیا جانو۔ اگر اب بھی فیضی کسی لڑکی سے پیار کرنے لگیں تو میں خوشی سے ان کے راستے سے ہٹ جاؤں گی اور کوشش کروں گی کہ ان کو بھرپور خوشیاں ملتی رہیں۔!"

"اچھا تو پھر اگر یہی حال رہا، تب ملتی رہ جائیے گا ہاتھ۔ اسی وقت ہوش آئے گا آپ کو۔"

"شینو! جب تو کسی سے محبت کرنے لگے گی تب پتہ چلے گا کہ کسی کے لیے مٹ جانے میں کتنی مسرتیں ہوتی ہیں۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال جیسے لمحوں میں ختم ہو گئے۔ میں باجی سے ملنے گئی تھی۔ فیضی بھائی ڈاکٹر ہو چکے تھے۔ ان کی پوسٹنگ اس دفعہ ایسی جگہ ہو گئی تھی جہاں وہ رہنا نہیں چاہتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ کسی اچھی جگہ ملنے پر باجی کو لے جائیں گے۔ فیضی بھائی میرے رہتے ہوئے آ گئے تھے۔

بڑے خوش تھے ان کا ٹرانسفر بہت اچھی جگہ ہو گیا تھا۔ وہ باجی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن جمیؔ باجی دوسرے ہفتہ میں جانا چاہ رہی تھیں۔ فیض بھائی نہ جانے کیوں بڑے اداس ہو گئے۔ باجی سے ذرا ناراض سے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "بتاؤ یہ شعر کیسا ہے؟

پہلے تو بے کلی تھی، ملنے کی آرزو میں!
اب ان سے مل کے یارب پھر اضطراب کیوں ہے؟

باجی ہنس پڑی اور میں فیض بھائی کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنے لگی کہ باجی کو سچ مچ وہ بے انتہا پیار کرتے ہیں۔؟

پھر اچانک یہ خبر ملی کہ جمیؔ باجی بہت بیمار ہیں۔ میں بدحواس ہو کر جب ان کے پاس پہنچی تو ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی صرف ان کی وہ پیاری صورت ہی دیکھ سکی تھی۔

جمیؔ باجی کی جوان موت نے سارے دلوں پر ایک قیامت ڈھا دی تھی، کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ جب سب کچھ ہو چکا تو سارے لوگوں کے ساتھ فیضی بھیا لٹے لٹے سے اکیلے میرے پاس آ گئے۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں ویران ویران سی نظر آ رہی تھیں۔

"شینو! جمیؔ چلی گئی۔ مگر کیوں چلی گئی؟۔ اب میں اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔!"

پھر وہ اپنے پاؤں کے تلوے سے تازہ مٹی نکال کر بڑے پیار سے مجھ کو دکھاتے ہوئے بولے "دیکھو شینو! یہ میری جمی کے قبر کی مٹی میرے تلوے میں لگ کر میرے ساتھ چلی آئی ہے۔ میں نے اندر جا کر جمی کو بڑے آرام سے سلا دیا ہے۔!

جمی باجی کی کہانی ختم ہوگئی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلی گئیں۔ فیضی بھیا کس کس طرح سے تڑپ کر جیے ہیں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مگر چار برسوں کے بعد ان کے گھر والوں نے ان کی اجڑی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے انھیں بے حد مجبور کر کے ان کی شادی کرادی۔ فیض بھائی نے اپنی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں لی وہ لڑکی کو جانتے بھی نہیں تھے لیکن صبی کو میں اچھی طرح سے جانتی تھی وہ میری دوست تھی میں اس کی رازدار تھی۔ اس کی سسکتی ہوئی آہوں اور کراہوں سے آگاہ تھی۔

میں جمی باجی کو اپنی زندگی کے کسی لمحے میں بھلا نہ سکی تھی۔ فیض بھائی سے کبھی کبھی ملنا ہو جاتا تھا۔ لیکن حقیقت میں، میں صبی اور فیض بھائی سے بہت دور ہو چکی تھی۔ فیض بھائی دو چار بار زبردستی مجھے اپنے گھر لے گئے تھے وہ دیکھنے میں بالکل نارمل لگتے مگر نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں اداس ہو کر جھک جاتی تھیں۔ صبی کے سامنے وہ عجیب بے بس سے نظر آتے ان کی شوخیاں مٹ چکی تھیں۔

اور آج ایک لمبے عرصے کے بعد اچانک میں خود ان کے گھر چلی گئی تھی۔ پتہ نہیں کون سی کشش مجھ کو کھینچ کر ان کے یہاں لے گئی تھی۔ بیچاری باجی کو کیا خبر ہوگی کہ آگ کے شعلوں میں کون سا دردناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میری آنکھوں میں جمی باجی کی ہنستی مسکراتی ہوئی صورت بار بار جھلک رہی تھی اور آگ کے لپکتے ہوئے شعلے میری نگاہوں، میرے ذہن و دماغ اور میرے دل و جگر کو جھلساتے جا رہے تھے۔ میری زخمی روح مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ جمی باجی کی جستجو کی آخری قربانی کا اندوہناک تماشا دیکھنا بھی میرا مقدر بن کر رہ گیا تھا۔!؟

— —

سویا ہوا خدا

فون پر پیغام سنتے ہی غصہ سے میرا چہرہ تمتا گیا۔ ایک کھوئی ہوئی مجبور سی بچی کو اگر رات کے آٹھ بجے اپنے خاندان سے بھرے ہوئے گھر میں تھوڑی جگہ دے دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا؟ مگر اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں سے یہ کون پوچھے؟

ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک سترہ اٹھارہ سال کی دبلی، پتلی خوبصورت سی لڑکی میلے سے نیلے رنگ کی جمپر اور آسمانی چست بلاوز پہنے میرے پاس پہونچا دی گئی تھی۔ میں یکدم سے چونک پڑی "ارے! یہ تو ایک جوان لڑکی تھی جس کو میں نے کہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں تو اس وقت کسی کھوئی ہوئی معصوم بچی کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر — مگر! یہ ایک جوان بے جھجک سی لڑکی؟ — یہ کہاں سے آ گئی؟۔

یہ کوٹھی میری تیسری بہن کی تھی، جہاں میں کچھ دنوں کے لیے آئی ہوئی تھی۔ آج یہاں دہلی سے آئے ہوئے مہمانوں کا ڈنر تھا۔ ملازمین تیز تیز چلتے ہوئے کام میں لگے تھے۔ لڑکی آرام کرسی پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ چکی تھی، گھنگھریالے بال گردن سے کچھ اوپر تک کٹے ہوئے تھے خوبصورت تراش کے گورے چہرے پر تھوڑی اُداسی چھا رہی تھی، اس کے منہ میں پانوں کی گلوریاں بھری ہوئی تھیں اور پان کی لالی لبوں پر اتنی جمی ہوئی تھی کہ کہیں کہیں سے کچھ سیاہیاں بھی

پھوٹنے لگی تھیں۔ اس کی چڑھی چڑھی نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں حیران ہو رہی تھی، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اور میں اس لڑکی کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ ــ رات کے اندھیروں نے جیسے میرے پاؤں میں بیڑیاں سی ڈال دی تھیں۔!

"تم کہاں سے آگئیں؟ ــ بھئی کہاں رہتی ہو؟ ــ تمھارا گھر کہاں ہے؟" ــ میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"اوہ! میرا باپ؟ ــ وہ امریکہ میں ڈاکٹر ہے ــ اور میری سوتیلی ماں نے مجھے مار مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔!... آج پانچ دن ہو گئے۔ اسی شہر میں! پرانے شہر میں رہتی تھی ــ اوہ ــ! میں پانچ دنوں سے بھوکی ہوں۔ بائی گوڈ ــ! مجھ کو کچھ کھانے کو دیدو ــ! پانی پلا دو" ــ اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں ــ اور میرا دل مچل کر رہ گیا ــ!

میری بہن شازی، چلتے چلتے ذرا کی ذرا رک کر بولی "اچھا! ــ یہی لڑکی تھی وہ؟ ــ! آگئی ــ؟ ــ مگر یہ تمھاری آنکھیں اس قدر چڑھی ہوئی کیوں ہیں؟ اور ــ اور یہ منھ بھر کے تم نے پان کیوں کھایا ہے؟ ــ ضرور تم نشہ آور دوائیں کھانے، یا چرس پینے والی لڑکی ہو، ــ یہ اتنے پان کھانے کے پیسے کہاں سے آگئے تمھارے پاس"؟

کام کرنے والے ملازمین ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے ــ لڑکی جیسے ایک تماشہ بن کر رہ گئی تھی ــ ایک اردلی نے ذرا جھک کر دیکھا اور دوسرے نے زور سے کہا "اے لڑکی! دیکھو ــ! یہاں کوئی گھپلا نہیں چلے گا۔ ہاں! یہ آئی۔جی پولس کی کوٹھی ہے۔ سمجھیں ؟؟

جمشید اردلی بڑے غور سے دیکھتا ہوا بولا "ادے یہ پاس کی کوٹھی میں

آج دوپہر کو تم سامنے برآمدہ میں کھانا کھا رہی تھیں نا؟ پھر آگے چوراہے پر۔ جب رکشا والا تم سے جھگڑا کر رہا تھا تو تم رو رہی تھیں۔ دو چار دوکانداروں نے رکشا والے کو دو تین روپے دے کر سمجھایا بھی تھا۔ اُس گھڑی بھی تم پان کھا رہی تھیں۔" میں جمشید کا منھ تکتی رہ گئی۔

لڑکی کی آنکھیں سچ مچ ۔۔۔۔ چڑھی ہوئی تھیں۔ شازی غصے سے لہک اٹھی "تم جیسی آوارہ گرد لڑکیاں، سارے شہر کو گندا کر رہی ہیں۔ میں تم جیسی لڑکیوں کو خوب جانتی ہوں۔ تم جھوٹ بولتی ہو کہ سوتیلی ماں نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے، اگر یہ بات سچی بھی تھی تو تمھیں گھر کا چوکھٹ پار کرنے سے پہلے اسی جگہ مرجانا چاہیے تھا۔ سمجھیں؟ شریف لڑکیاں اس طرح منھ میں پان ٹھونس ٹھونس کر نشے سے چڑھی آنکھیں لیے دوسروں کے گھروں میں دندناتی نہیں پھرتیں۔"

میں خود بھی ایک تماشائی بن کر رہ گئی تھی ــــ کیا سچ ہوگا؟ ــــ اور کیا جھوٹ۔؟ میں ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گئی تھی ــــ کیونکہ یہ سارا کھیل میری ہی وجہ سے یہاں کھیلا جا رہا تھا۔!

لڑکی نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے شازی کو گھور کر دیکھا۔ اپنے کٹے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے ٹھیک کیا۔ "کدھر ہے تمھارا باتھ روم۔"؟ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اپنے سوتے ہوئے اعصاب کو سنبھالنے اور جگانے کی کوشش کرتی ہوئی قریب ہی باتھ روم میں مُنھ ہاتھ دھونے لگی۔ پان کی لالی پانی پڑنے سے اور نکھر آئی تھی ــــ آنکھوں کا نشہ ٹوٹتا ہوا نظر آتا تھا، چھوٹا سا تنگ آسمانی بلاؤز اس نے کھینچ کر بلو جین کی بیلٹ تک لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ باتھ روم سے لگے ہوئے شازی کے بیٹے کے بیڈ روم میں وہ آرام سے پیر پھیلا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ گھر کے کچھ دوسرے ملازمین بیڈ روم کی چوکھٹ سے جھانک جھانک کر

تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں اس کھیل اور اس مکروہ کھلونے سے تھک گئی تھی۔ ندامت کا احساس خود میری آنکھوں سے جھلکنے لگا تھا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے کہا "سنو! تم جو بھی ہو۔ جیسی بھی ہو۔ تمہیں اس طرح اپنے گھر سے نکلنا نہیں چاہیئے تھا۔ تم نے آخر یہ پانچ دن کہاں گذارے۔ کس کس کے پاس رہیں۔؟ بتاؤ۔؟ اب کون سا منھ لے کر اپنے گھر جاؤ گی؟"

"اوہ! ـ پلیز مجھے کچھ روپے دیدیں۔ پلیز گو می سم روپیز۔! آئی وانٹ سم روپیز! آئی ام ویری ہنگری ـ! اوہ ..... پلیز۔ پلیز"

اور وہ اپنی گود میں لیے تکیے پر جھک گئی ـ!

میں نے دعوت کے کھانوں میں سے ایک پلیٹ عمدہ کھانا اس کے لیے منگایا۔ مگر کھانا دیکھتے ہی جیسے اس پر دورہ سا پڑ گیا۔ "؟ آپ لوگوں نے میرا انسلٹ کیا ہے۔ میں اس گھر کا کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اس بڈھے نے مجھے تم جنگلیوں کے پاس کیوں بھیجا تھا؟ ہونہہ!! میں نشہ کرتی ہوں۔؟ میرے باپ نے مجھے کونونٹ میں پڑھایا تھا ـ مگر سوتیلی ماں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے "۔!

روپ نرائن ڈرائیور نے ادب سے میرے پاس آکر کہا "بیگم صاحب دس دن ہوئے یہ لڑکی ایک بلورنگ کی نیٹ میں ایک لڑکے کے ساتھ جا رہی تھی۔ تھوڑی دور جا کے نیٹ والے لڑکے نے دھکا دے کر ایک کنارے اس لڑکی کو گرا دیا تھا اور بڑی تیزی سے گاڑی چلا کر بھاگ گیا تھا۔ یہی کپڑے اس دن بھی یہ پہنے ہوئے تھی "!

شازی نے مجھے اشارے سے بلایا۔ کہنے لگی۔ میں نے پرانے شہر کے رہنے والے ایک ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی سے اس لڑکی کا حلیہ بتا کر

پوچھا کہ "آپ جانتے ہیں اُسے"؟ کہنے لگے اس کو فوراً ہٹائیے۔ ورنہ آپ کا گھر بدنام ہو جائے گا۔" ابھی میں نے کھانے پر آئے ہوئے ایک پولیس افسر کو کنارے لے جا کر ساری باتیں بتائی ہیں۔ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں، بچالے نے خود ہی پولس اسٹیشن میں فون کر دیا ہے کہ دو لیڈی کانسٹبل کے ساتھ اس لڑکی کو اس کے گھر لے جا کر پہنچا دیا جائے۔ میں نے اپنے گھر کا پتہ نہیں دیا۔ باجی کا پتہ لکھا دیا ہے، بھیا بھی آئے ہوئے ہیں پولس والے وہیں سے اس کو لے جائیں گے۔"

میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ بعض دفعہ لمحے اور وقت کیسے کیسے چکروں میں ہمیں ڈال کر خود اپنے لیے ہمیشگی اختیار کر لیتے ہیں۔

جیپ کی اگلی سیٹ پر بڑی شان سے وہ اکڑ کر بیٹھ گئی، جیسے یہ اسی کی اپنی گاڑی ہو۔ پان کی سرخیوں سے بھرے لبوں کو اس نے نفرت سے سکیڑ کر کوٹھی کے گیٹ کو دیکھا، چڑھی ہوئی آنکھوں میں غصے کے اُبلتے ہوئے لاوے بھر گئے تھے ـــــ

"ہونہہ۔ بڑے افسر کی بیگم بنی پھرتی ہے۔ ایٹی کیٹ تک نہیں جانتی۔ میں نشر کرتی ہوں "ـــ" اوہ! مائی گوڈ ـــ! ارے! یہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟ ـــ روکو گاڑی، روکو ـــ! بس اسی سڑک پر مجھے اتار دو ـــ پلیز ـــ! گاڑی روک دو بھائی"!

مگر گاڑی چلتی رہی اور اُسی گیٹ پر آ کر رکی جہاں اس لڑکی کو اُتارنے کو کہا گیا تھا ـــ!

جمشید نے اندر جا کر باجی کو جلدی جلدی سرگوشیوں میں کچھ بتایا اور جیپ کے پاس آ کر اُس بے نام سی لڑکی سے اُترنے کو کہا۔ مگر وہ اس گیٹ تک آتے

آتے اینٹھ چکی تھی، " تم مجھے اس گھر میں اُتارنے والے کون ہو؟ - لڑکی کڑک کر بولی، اس کی آواز میں نشے کی لرزش تھی " ارے بھائی اتر بھی جاؤ۔" باجی پڑوسیوں کا خیال کرتی ہوئی خود ہی آگے بڑھ آئی تھیں - باجی لڑکی کو اپنے ساتھ لیے جب اندر آئیں تو گھر کے بچوں اور نوکروں نے یہاں بھی ایک گھیرا ڈال دیا تھا، باجی نے اپنے چھوٹے بھائی کو پکارا وہ اوپر کی منزل سے اپنی بیگم کے ساتھ نیچے آگئے اور بے حد رحم بھری نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے بولے - "دیکھو تم نے اپنے گھر سے نکل کر کتنی بڑی غلطی کی ہے تمہارے گھر کے لوگ کس قدر پریشان ہوں گے - اور اگر تم برے ہاتھوں میں پڑ جاتیں تو پھر بتاؤ کیا ہوتا؟" لڑکی نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے اُس مہربان کو دیکھا " پلیز گو ٹو یور روم - پھر میں چلی جاؤں گی - اوہ اب میں بہت تھک گئی ہوں " اور وہ باجی کے بستر پر ان کے تکیہ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی - یہ خواہ مخواہ کی مصیبت باجی کے گھر پر شازی نے ایسی اچانک ڈال دی تھی کہ سبھی چکرا گئے تھے " پولس والوں کے صرف آنکھیں ہوتی ہیں - ان کے پاس دل نہیں ہوتا " شازی کے بھیا کا دل موم کی طرح پگھلا جا رہا تھا - انھوں نے دس روپے کا ایک نوٹ لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا - روپے میں کوئی خوشبو نہیں تھی - وہ کوئی جادو بھرا کاغذ کا ٹکڑا بھی نہیں تھا - مگر اس نوٹ کو پاتے ہی لڑکی کے چہرے کے زرد رنگ پر سرخیوں کے چھینٹے سے پڑ گئے - خوشیوں سے اس کا چہرہ لہک اٹھا، لبوں پر پان کے سوکھے اور مرجھائے رنگ پر بھی جیسے نکھار سی آگئی تھی اس کا موڈ اچانک بڑا بدل گیا تھا اس نے اطمینان سے کھانا کھایا، دبی دبی آواز میں پولس والوں کو گالیاں دیتی رہی - پھر برآمدے کی چوکی پر بچھے فرش پر تکیہ لگا کر بڑے سکون سے لیٹ گئی - سڑک خاموش اور ویران تھی - باجی کی پیشانی پر

ناراضگی کی شکنیں ابھی تک پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دلی اضطراب، غصّے اور بے چینی سے مسلسل چل پھر رہی تھیں۔ لڑکی نے ذرا مسکرا کر بھیّا کی بیگم کو دیکھا "مجھے ڈر لگ رہا ہے ــــ میں اکیلی کبھی نہیں سوتی ــ آپ! آپ بھی آجایئے نا یہیں میرے پاس " بھابی نے ہنستے ہوئے کہا " تم سو جاؤ! میں تمھارے پاس ہی رہوں گی " بار بار کئی تکیے لڑکی کو لگاتے ہوئے دیکھ کر باجی چڑچڑی سی ہو رہی تھیں۔ جل کر بولیں " اور جو تم پانچ دنوں سے ماری ماری پھر رہی ہو۔ تب! تب ساری رات تمھارے پاس کون ہوتا تھا "۔؟ لڑکی کا چہرہ یکدم سے ماند پڑ گیا، چڑھی ہوئی آنکھیں چپکے سے بند ہو گئیں۔ اور وہ سوتی سی بن گئی۔ گھر والوں کو پولس کا انتظار تھا۔ باجی اس جھمیلے کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں بس تھوڑا سا ہی وقت گزرا ہوگا کہ باہر گیٹ پر کسی بڑی سی گاڑی کے رکنے کی آواز کے ساتھ ہی تیز تیز ہارن بجنے لگا تھا۔ لیڈی کانسٹبل اندر آگئی۔ لڑکی بے خبر سو رہی تھی، بھابی نے بازو پکڑ کر ہلایا " دیکھو! تمھیں گھر پہنچانے کے لیے گاڑی آگئی ہے۔ ایک اچھی سی لڑکی کی طرح اپنے گھر چلی جاؤ۔ لڑکیاں بہت نازک ہوتی ہیں۔ باہر کی ہوا انھیں پل بھر میں جھلس دیتی ہے۔ جاؤ! دیکھو یہ لیڈی کانسٹبل تم کو عزت کے ساتھ تمھارے گھر پہنچا دیں گی " لڑکی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی " اوہ! یہ سب کچھ اسی پولس افسر کی بیوی نے کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے "! جب وہ بھیا کے پاس سے گزر کر پولس وین پر بیٹھنے لگی تو بڑے پیار سے بولی ـــ! تھینک یو ـــ فور یور منی ـــ اچھا! بائے ـــ!" خود بھیّا کا سر ندامت سے جھک گیا۔ ڈرائیور اور دوسرے سپاہیوں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ اس لڑکی کو اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا کر وہاں سے رسید لے لی جائے اور اسی رات وہ رسید یہاں دے کر تب پولس وین واپس

جائے گی ۔۔۔! اتنی بڑی پولس وین اور ایسی ڈرامائی کیفیتوں والی لڑکی کے چلے جانے کے بعد سب کے ذہنوں پر سے بوجھ اُتر گیا تھا، گھر خالی خالی نظر آرہا تھا ہلکا پھُلکا جیسے یہ گھر نہیں جوہی کا ایک نازک سا پھول ہو۔ جلی بھُنی باجی نے سب سے پہلے تکیوں کے غلاف اُتارے اور بچھی ہوئی چادریں مرے ہوئے چوہے کی طرح چٹکیوں سے پکڑ کر باتھ روم کے کونے میں ڈال آئیں۔

پولس وین پر بیٹھی ہوئی لڑکی بڑی ہوشیاری سے اپنے گھر کا پتہ بتاتی جارہی تھی۔ ایک سڑک۔ ایک موڑ ۔۔۔ پھر دوسری سڑک، کئی چکر لگاتے ہوئے راستوں سے چلتی ہوئی پولس وین ایک بہت بڑے محل سرا کے پھاٹک پر جاکر رک گئی۔ ہارن بجا۔ اور پھر کئی بار بجا۔ لڑکی جھپٹ کر گاڑی سے اتر گئی۔ جھومتے ہوئے ہودے سمیت ہاتھی کے گذر جانے والا ہمارا جوں جیسا پھاٹک جوں کا توں بند رہا۔ لیکن اسی بہت شاندار پھاٹک میں اندر جانے کے لیے گیٹ کھُل گیا۔ لڑکی جھپٹ کر اندر چلی گئی، لیڈی کانسٹبل اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ پولس وین پر سے کئی دوسرے سپاہی اتر کر اندر چلے گئے۔ رات کے سنّاٹے میں بھی اس پُر جلال مگر ویران عمارت کے پُرعظمت سائے دلوں پر اپنا رعب ڈال رہے تھے۔ گیٹ کھولنے والے کے چہرے سے خاندانی وجاہت ٹپک رہی تھی۔ کم پاور کی جلتی ہوئی روشنی میں ان کا سفید رنگ اور معمولی لباس حالات کی شکستگی کا اظہار کر رہے تھے۔ انھوں نے بڑے خلوص سے پولس والوں کا شکریہ ادا کیا۔ بچی ناراض ہو کر اپنے رشتہ داروں کے یہاں چلی گئی تھی۔ رسید دینے کے لیے وہ سپاہیوں کو ساتھ لیے اپنے محل سرا کے اس بڑے کمرے میں چلے آئے جہاں خاندان کے بزرگوں کی تصویریں سنہرے پھولدار چوکھٹوں میں جڑی دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ خوبصورت قالین

اور قیمتی فرنیچروں سے کمرہ آراستہ تھا۔ محل سرا کے اتنے شاندار گیٹ سے نکلتے ہوئے بے اختیار سپاہیوں نے بڑے ادب سے صاحبِ خانہ کو سلام کیا اور رسید لے کر نکل آئے۔

پولس وین کا ہارن تین بجے رات کو جب باجی کے گیٹ کے سامنے گونجا تو وہ اور بھی سمٹ کر رہ گئیں۔ بھابی اور بھیا کو رسید کا شدید انتظار تھا وہ باہر نکلے۔ سپاہیوں نے حیران ہو کر الف لیلیٰ کی سی کہانی سنائی۔ "حضور بہت بڑے گھر کی لڑکی تھی۔ بڑے اونچے گھرانے کی۔"

پولس وین کے جاتے ہی گیٹ پھر آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔ لڑکی گھر کے اندر چلی گئی۔ ایک بہت بڑے کمرے میں میلی چادروں والے کئی بستر پلنگوں پر بچھے ہوئے تھے۔ پاس ہی دوسرے کمرے میں ایک خوبصورت مسہری پر کوئی عورت بے خبر سو رہی تھی۔ برآمدے کی ہلکی روشنی میں اس کے سفید کپڑوں کی جھلک کبھی کبھی دکھائی دے جاتی تھی۔ لڑکی نے بیزار سی نگاہیں ہر طرف ڈالیں۔ پلنگ پر بیٹھی ہوئی عورت بڑے پیار سے اس کو دیکھتی ہوئی اس کے قریب آئی "کیا ہوا نگو؟ — ایسی بکھری بکھری سی کیوں لگ رہی ہو —؟ اور یہ پولس والوں کا کیا قصہ تھا؟ — یہ پورے پانچ دن تم کرتی کیا رہیں؟ اس عورت کی آواز میں غصے کی دبی دبی چیخ تھی — لڑکی سسکتی ہوئی اس عورت کی گود میں ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گئی۔

"ممی — چند روپوں کے سائے کے پیچھے بھاگتی بھاگتی میں تھک گئی ہوں — اب! اب — مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا — میں — میں تو اپنے لیے دو چار گولیاں بھی مشکلوں سے خرید پاتی ہوں' — ممی تم نے ہم چار بہنوں کو کس کس طرح سے صلیبوں پر چڑھا رکھا ہے۔ یہ دیکھو ممی۔ ادھر دیکھو۔۔

نغمہ کا بستر ابھی تک خالی پڑا ہے۔ اور وہ بچاری ساری رات کی قیمت کیا لائے گی؟۔ چند چھوٹے بڑے سکّے جو دو دنوں کے لیے بھی کافی نہ ہوں گے۔ میرے پاس ان پانچ دنوں میں بس اتنے ہی آسکے ہیں، یہ پانچ کا نوٹ اس بڈھے نے دیا تھا جس نے مجھے ایک ایسی جگہ بھیج دیا تھا جہاں میں بالکل کھول کر رکھ دی گئی تھی۔۔ میری آنکھوں کو دیکھ کر اس پولس والے کی بیوی نے بڑا شور مچایا۔۔ اور یہ دس کا ایک نوٹ اس بچارے آدمی نے دیا ہے جو مجھ کو ایک معصوم لڑکی سمجھ رہا تھا۔ وہ بڑے طنز سے مسکرائی" معصوم بھولی بھالی جیسے کنول روپ کے نام سے کبھی تم بھی جانی جاتی تھیں' اور میرے باپ نے اس محل کے سارے خاندانی ہیرے جواہرات اپنی عزّت و ناموس کے ساتھ تمہارے گھنگھروں کی جھنکار پر لٹا دیے تھے۔ اور جب ان کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ کچھ بھی نہ رہا تو تم نے سمجھا کہ وہ اب اپنی دولت تم سے چھپا رہے ہیں۔ اور تم ان کا بھوت پکڑنے کے لیے ان کے ساتھ یہاں چلی آئیں۔ تم جو میری اپنی ماں ہو۔ تمہیں یہاں دیکھ کر اس محل سرا کی اینٹیں تک لرز اٹھی تھیں، لیکن تم کو یہاں کیا ملتا ممی۔؟ پاپا کی رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی تو نہ بچا تھا" ماں نے پاگل کی طرح بڑبڑاتی ہوئی بیٹی کو ڈانٹنا چاہا لیکن آواز نہ نکل سکی۔" ممی! آج مجھے جی بھر کے بولنے دو۔۔ میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ تم جو رونق محفل تھیں۔ اپنے گھر کی دولت تھیں۔ تم فرشتوں کے پہرے کے باوجود اس مقدّس گھر میں ابلیس کی طرح گھس آئیں" لڑکی سسک سسک کر روتی ہوئی پلنگ پر اوندھے منہہ گر پڑی۔!" میں تیری گندی زبان داغ دوں گی کمبخت' بدتمیز"۔ مگر۔ لڑکی پر پانچ دنوں کی ناکامیوں اور تھکن کا جیسے بھوت سوار تھا۔! اس نے تلملا کر سر اٹھایا" تم نے اس گھر میں اپنے کوٹھے کی زینت بننے والی

جیسی چار بیٹیاں پیدا کر کے میرے لٹے ہوئے خاندان کی بنیادوں کو اور بھی ہلا کر رکھ دیا...... اوہ ماں۔ یہ تمھاری بیٹیاں تمھاری ماں کی محفلوں میں اپنے گھنگھروؤں کی جھنکاروں سے دولت کے ڈھیر لگا سکتی تھیں۔ ماں ـــ ممی! ہمیں اس طرح نہ تھکاؤ جیسے کنگالوں کے بچے ہر پلیٹ فارم پر کھانا کھاتے ہوئے مسافروں سے جونک کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔ اندھیروں میں چھپا چھپا کر تم ہمارے تماشے کرتی رہیں۔ مگر اب نقاب کی جالیاں تار تار ہوتی جا رہی ہیں۔ ہم کب تک زمانے کی نگاہوں سے چھپتے رہیں گے۔ ماں تم نے پاپا کو افیون کی گولیاں کھلا کھلا کر ان کو اونگھتے رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ بے حس ہو چکے ہیں ممی ـــ تمھارے پائل کے بول کیوں گونگے ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے خون کی گردشوں میں کبھی کبھی تیز جھنکاروں کی گونج اٹھا کرتی ہے۔ اب تاریکیوں کا سہارا مت لو۔ ا روشنیوں...... کی طرف چلو ـــ ان اندھیروں نے تین برسوں میں مجھے تھکا کر چور چور کر دیا ہے۔"

لڑکی نے نفرت کی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اس پر دیوانگی چھائی ہوئی تھی۔ بولتے بولتے وہ ہانپنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ اور بڑھ گئی تھی ـــ" ہماری دادی اماں نے اپنے محل سرا کی اتنی اونچی اونچی دیواروں اور ان کے کنگوروں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہماری عزتوں کی طرف سے اطمینان کر لیا تھا۔ انھیں گھر پر چھائی ہوئی غربتوں کے سائے لرزا دیتے ہیں۔ مگر وہ پُروقار عورت اُن چھا جانے والے سایوں سے خوف زدہ نہیں ـــ! وہ ان چار جوان لڑکیوں کو اپنی بوڑھی آنکھوں کی داری میں سمیٹے ہوئے ہیں جن کو تم نے بھرے بازار میں ایک ارزاں ترین جنس بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان سنگین دیواروں میں کبھی تم نے کیسی کیسی دراڑیں پیدا کر دی ہیں ماں"؟

رات کا اندھیرا ہلکا پڑتا جا رہا تھا ہواؤں میں تازہ پھولوں کی خوشبو اور ناز کی بھر گئی تھی، غم و غصے میں بپھری ہوئی ماں اپنے پلنگ پر لیٹ چکی تھی .....

دوسرے کمرے میں سوئی ہوئی عورت جاگ گئی تھی۔ اس نے بڑے پُر وقار مگر پیار بھرے لہجے میں پُکارا ــ "میری سوئی ہوئی فرشتو! اب اٹھ جاؤ بچیو۔ دیکھو کیسی پیاری صبح نکھرنے جا رہی ہے"۔! لڑکی کی آنکھیں روتے روتے سُوج گئی تھیں۔ وہ پلنگ پر اب تک اسی طرح اوندھی پڑی تھی ــــ اپنی سسکیوں کو مشکلوں سے روکتے ہوئے بڑی غمناک آواز میں بولی ــ!" سو جائیے دادی اماں، سو جائیے! ابھی تو خدا بھی سو رہا ہے ــــ پتہ نہیں وہ کب سے سویا ہوا ہے اور کب تک سوتا رہے گا ــ!

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا...

کافی دنوں کے بعد مجھ کو اچانک یہ خبر ملی کہ سہیل عظیم آبادی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ پٹنہ میڈیکل کالج ہوسپٹل کے انٹینسو کیر روم میں ہیں۔

اختر صاحب کی طویل بیماری نے مجھے ساری دنیا سے بالکل الگ کر دیا تھا۔ لیکن سہیل صاحب کی ذات ایسی نہ تھی کہ میں ان کی بیماری کو نظر انداز کر دیتی۔ وہ اختر صاحب کے بہت پرانے دوستوں میں سے تھے پھر جب وہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن میں آئے تھے مکان کی قربت نے انھیں ہم لوگوں سے اور بھی نزدیک کر دیا تھا۔

میں اسی دن شام کو اسپتال گئی۔ وہ اپنے بیڈ پر خاموشی سے لیٹے ہوئے تھے۔ اسی کمرے میں دو مریض اور بھی تھے جن کو آکسیجن لگا ہوا تھا۔ سہیل صاحب بہتر ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چونک پڑے "ارے آپ؟ — آپ کیوں آگئیں اختر کو اکیلا چھوڑ کر۔۔؟"

"مجھے آنا ہی پڑا سہیل صاحب۔ پتہ نہیں بہار کے ان ادیبوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔" وہ مسکرانے لگے "میں تو اب اچھا ہوں۔ بس ذرا دلِ بیتاب کی دھڑکنیں کچھ زیادہ مضطرب سی ہو گئی تھیں۔"

"ساری جوانی زشتوں سی گذار کر۔ اب اس بڑھاپے میں دل کا روگ لگانا نہیں چاہیے تھا۔"

وہ چپکے چپکے بڑی معصوم ہنسی ہنس کر بولے "یہی سمجھیے ناکردہ گناہوں

کی سزا ہے۔"

ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کیونکہ نگاہوں کے سامنے دو بستروں پر ایسے مریض تھے جو آکسیجن کے بعد بھی مشکل سے سانس لے رہے تھے، کمرے کے اندر ہلکی ہلکی سی روشنی میں زندگی اور موت کی کشمکش دیکھ کر دل کانپ رہا تھا چند الجھی ہوئی سانسوں کی جدوجہد، مجبور و بے بس انسان کی خود سپردگی مونیٹر کے ٹیشوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتی ہوئی بہت اونچی نیچی سی مایوس کن لکیریں۔ بس! بس یہی حیات کے چند اجڑے ہوئے نقوش تھے جو آہستہ آہستہ مٹتے چلے جائیں گے اور رفتہ رفتہ ان کی زندگی کی ایک مختصر سی کہانی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گمنامیوں کے اندھیروں میں چھپ کر رہ جائے گی، جس طرح درختوں سے جھڑے ہوئے پتے ہوا کے جھونکوں سے کچھ دنوں تک زمین میں ڈولتے پھرتے ہیں۔ پھر ان کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کہاں چلے گئے اسی طرح ایک رسی بسی مسکراتی زندگی بھی تارِ نفس کے ٹوٹ جانے پر ہم سے سارا رشتہ توڑ لیتی ہے جیسے بس وہ خواب تھا یا ہواؤں کے دوش پر دم بھر کے لیے خوشبوؤں کا ایک لطیف سا جھونکا!

میں بوجھل بوجھل سا دل لیے گھر واپس آگئی، اختر صاحب کو سہیل صاحب کی بیماری کی خبر بھی نہیں دی۔

سر پر سفید بے ترتیب بڑھے ہوئے بال، چہرے پر چھائی ہوئی معصومیت، لبوں پر پان کی سرخی، آنکھیں اداس اداس سی، کھادی کے کرتے پیجامے اور سردیوں میں کرتے کے اوپر جواہر کٹ کھادی کی جیکٹ، میں نے سہیل صاحب کو ہمیشہ اسی انداز سے دیکھا۔ اور یہی ان کی امتیازی خصوصیت بھی تھی۔ دوستوں کی منڈلی میں انھیں ہنستے مسکراتے ہوئے تو دیکھا کرتی تھی

مگر کبھی ان کو قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا' میرے گھر میں جب بھی اختر صاحب کے احباب اکٹھے ہوتے تو وہ ایک زعفران زار محفل ہوا کرتی تھی جس میں اختر صاحب کے قہقہے سب سے زیادہ گونجدار اور اونچے ہوتے تھے۔ لیکن سہیل صاحب کو اس محفل میں بھی کھل کر ہنستے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں ہمیشہ ان سے یہی کہا کرتی تھی۔

"اتنے بالوں کا بوجھ جب تک آپ کے سر پر رہے گا آپ اسی طرح سے مُرجھائے مُرجھائے سے رہیں گے۔"

لیکن وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے کہتے "آپ کو اختر کے قہقہوں کی عادت پڑ گئی ہے اور میری بیوی کو صرف میری مسکراہٹ اچھی لگتی ہے۔"

سہیل صاحب بہت سادگی پسند تھے' اور ان کی اسی چیز کی میں قدر کیا کرتی تھی۔ ان کی طبیعت میں خلوص و انکسار کا بھرا ہوا تھا۔ جہاں کسی نے پیار سے باتیں کر لیں بس اسی کے ہو رہے ہیں بار بار یہی سوچا کرتی کہ بہار کے دو مشہور ادیب جو میری نگاہوں کے سامنے تھے ان پر خاندان کی' اپنوں کی' دوستوں کی محبتیں کتنی نثار ہوا کرتی ہیں پھر بھی جو کہیں وقتی طور پر محبت کی دو بوندیں مل جاتی ہیں' تو جیسے انھیں زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیسی تشنگی تھی ان کے دلوں میں جو کبھی انھیں سیراب نہیں ہونے دیتی۔؟

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے سہیل صاحب کو چھوٹا ناگپور انجمنِ ترقی اردو کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ چھوٹا ناگپور اپنے حسن و رعنائی کے ساتھ سہیل صاحب کے ذہن و دماغ پر چھا کر رہ گیا تھا۔ سکھوا کے تناور اور ساگوان کے گھنے خوبصورت جنگلوں سے بھرے اونچے نیچے پہاڑوں کے حد نظر تک پھیلے ہوئے سلسلے' بل پر بل کھاتی ہوئی پہاڑی ندیوں کا شور' زینوں کی طرح اونچے نیچے بنے ہوئے دھان کے ہرے ہرے کھیتوں کی قطاریں' نیم وحشی سے آدھے جسموں

سے ننگے انسان، جن کے کالے کالے صحت مند چہروں پر چمکتی ہوئی آنکھیں اور سفید موتیوں جیسے دانت بہت نمایاں لگتے تھے۔ سُرخ مُرم بچھی زمینوں کے یہ باسی اپنے ننگے جسموں کو جنگلی پھولوں سے بجائے رکھنے کے بہت شوقین تھے، سنورے ہوئے بالوں میں کنگھیاں پھولوں کے بوجھ سے ڈھکی رہتی تھیں۔ مردوں کے ہاتھوں میں تیر کمان رہتے اور الھڑ نوجوان لڑکیوں کے چکنے چہروں پر لوٹ پوٹ کرتی ہوئی مسکراہٹیں ہوتیں۔ یہی چھوٹا ناگپور کا حسن تھا اُسی سادگی و پرکاری میں اسی سکون و سناٹے میں دنیا کی ازلی خوبصورتی سمٹ کر دلوں کی دھڑکنیں بن گئی تھیں۔

سہیل صاحب نے اسی دنیا بھر کی دولت اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے چھوٹا ناگپور کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز کو سُنا، اسے محسوس کیا، اور پھر ان دھڑکنوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی کہانیوں میں محفوظ کر لیا۔

رات کے اندھیروں میں جب ساری فضا کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی قریب کے گاؤں سے ڈھول کی آواز میں اجنبی زبان کے ایک ساتھ اٹھتے اور گرتے ہوئے سُروں کے گیت، ہواؤں کے جھونکے سنانے لگتے تھے تب ایک ادیب کا دل مسرتوں سے جھوم جھوم اٹھتا تھا وہ آدی باسیوں کے میلوں میں جاتے رہے، وہ راتوں کو ان کے ہنڈیا پی پی کر مست ہو اٹھنے والے رقصوں میں شریک ہوتے رہے، اور اراؤں، منڈا اور آدی باسیوں کی بستیوں میں جا کر وہ ان کے لہکتے ہوئے "الاؤ" میں اپنے ہاتھ سینکتے رہے تب کہیں جا کر وہ ایک کہانی کار بنے تھے۔

آج مجیب کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ جب ان کا شعور جاگا تھا تو اپنے گرد و پیش کو دیکھ کر انھوں نے جو کچھ بھی محسوس کیا اور ان کے دل میں

جو ورود مسرت کا اولین احساس ہوا، وہ ہر کسی کا حصہ نہیں ہوتا۔ یہ لطیف سی کسک بڑے نازک سے ذہن اور روح کی گہرائیوں میں اس وقت اترتی ہے جب فضائیں نوائے سروش سے منوّر، معطر اور لطیف ہو جاتی ہیں، تب انھیں شعاؤں سے روشن ہو کر مجیب کا نام سہیل عظیم آبادی بنا اور دنیائے ادب میں چمکنے لگا ــــ

میں سہیل صاحب کو بہت قریب سے جانتی ہوں، وہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن میں شعبۂ اردو کے انچارج تھے میرا گھر اور مرتضےٰ جو باغ میں تھا جب بھی ان کو فرصت ملتی ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ انھیں میرے گھر کی روغنی روٹی بھنا ہوا گوشت اور رول کیا ہوا آملیٹ بہت پسند تھا وہ چائے میں دودھ کی جگہ لیموں استعمال کرنے کے عادی تھے۔ ہم تینوں مل کر بہت دیر دیر تک دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے۔ سہیل صاحب کو میں نے کبھی کسی بات پر بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ کبھی شعر و ادب کے کسی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے نہ موجودہ بحران پر کسی قسم کا اظہار خیال کرتے۔ آخر ایک دن تھک کر میں نے ان سے کہہ دیا۔ "میں سب جانتی ہوں سہیل صاحب آپ ہر ایک کو خوش رکھنا چاہتے ہیں، چاہے وہ پرانی ڈگر پر چلنے والا ہو یا امریکن پرفیوم سے معطر ہو..... آپ سب کے اپنے ہیں۔"

وہ پٹنہ ریڈیو میں تھے جب کبھی میرا پروگرام ہوتا سہیل صاحب اپنا سارا کام چھوڑ کر اخلاقاً میرے ساتھ ریکارڈنگ روم میں آجاتے تھے وہ اناؤنسر والے حصے میں چلے جاتے اور دوسرے کمرے میں ان کے قریب ہی میں ریکارڈنگ کرانے لگتی۔ بس شیشے کی ایک دیوار ہم دونوں کے درمیان میں ہوتی۔ پڑھتے پڑھتے جب کبھی میری نگاہیں ان کی طرف چلی جاتیں تو وہ ہاتھ کے اشارے

سے مجھے تیز تیز پڑھنے کی تاکید کرتے، پھر جوان کو دیکھتی تو وہ اپنے ہاتھ سے آہستہ آہستہ پڑھنے کا زبان جاری کر رہے ہوتے اور یہاں میری حالت عجیب شکنجے میں پھنسی ہوئی ہوتی۔ ایک تو سامنے لال جلتی ہوئی بتی اور اس پر سے کبھی جلد جلد اور کبھی آہستہ آہستہ پڑھنے کے اشارے، اللہ اللہ کر کے جب پروگرام ختم ہو جاتا تو پھر میں سہیل صاحب سے جھگڑنے لگتی تھی "ہاں تو اب! آپ مہربانی فرما کر میرے ساتھ نہ آیا کریں گے اچھا خاصہ میرا افسانہ غارت کر دیا" اسی طرح میں کئی بار جھگڑا کر چکی تھی۔

ایک دفعہ کرشن چندر اور ان کی بہن سرلا جب رانچی سے واپسی میں پٹنہ آئیں تو سہیل عظیم آبادی نے ہم لوگوں کو کسی قسم کی کوئی خبر نہیں دی اور انھیں عزیزہ نقی امام کے فلیٹ میں ٹھہرا دیا۔ شام کے وقت کرشن چندر جی اور سرلا بہن کو ہم لوگوں سے ملانے اپنے ساتھ لائے۔ میرے ساتھ اختر صاحب کو بھی شکایت تھی کہ تم نے ہمیشہ ہمارا حق مارا ہے، کرشن چندر جی بھی کچھ اداس سے ہو گئے۔ میں نے تو یہ لڑائی ہفتوں سہیل صاحب سے لڑی مگر ان کو تو جھگڑا کرنا کبھی نہیں آتا تھا۔ تھک ہار کر رہ گئی۔

اسی طرح مارچ کا پہلا یا دوسرا ہفتہ تھا۔ میرے احاطے کے پھولوں پر سے بہاریں رخصت ہو رہی تھیں، سہمی سہمی پنکھڑیوں کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ گرد اڑنے لگی تھی اور ہواؤں میں گرمی کی خلش سی بھر گئی تھی، شام کے وقت سبزے پر پانی کا چھڑکاؤ کرا کے چوکی پر سفید فرش لگوا دیا تھا۔ لائٹ کا کنکشن پہلے ہی باہر کی طرف تھا، جب تھوڑا اندھیرا ہو گیا تب میں نے لیمپ جلا کر "نقوش" پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی میں نے سمجھا اختر صاحب آ گئے مگر سہیل صاحب سامنے سے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے سفید ساڑی میں لپٹی

ایک لڑکی چلی آ رہی تھی، میں "نقوش" سے "پھوڑ" سنبھل کر بیٹھی۔ سہیل صاحب نے آتے ہی تعارف کرایا۔ "یہ ہماری جیلانی بانو ہیں اور یہ شکیلہ اختر"

"تو پھر آپ نے بانو پر بھی اپنا ہی قبضہ جما لیا نا۔؟" میں بے اختیار بول اٹھی۔ آخر آپ کب تک اس طرح سے راہ زنی کرتے رہیں گے۔ سہیل صاحب" میں بپھر پڑی۔ جیلانی بانو مجھ سے لپٹ گئیں۔ اور میں ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی "بانو! تم تو چینی کی گڑیا جیسی لگتی ہو۔ دیکھو تم کو بھی سہیل صاحب چرا کر لے گئے نہ۔؟" اور قریب ہی بیٹھے ہوئے سہیل صاحب بڑے مزے میں اس کھیلے جانے والے تماشہ کو دیکھ رہے تھے شاید ان کو ہمیں اس طرح ستانے میں مزہ ملتا ہے تھا۔

ہمیشہ سے سہیل صاحب کی زندگی کا یہی دستور رہا تھا کہ وہ روزانہ دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو درجنوں کے حساب سے خط لکھا کرتے تھے، جن لوگوں سے ان کی ملاقات تھی ان کو بھی اخلاص و محبت بھرے خط لکھا کرنے اور جن ادیبوں اور شاعروں سے کبھی نہیں ملے تھے اور انھیں ان کا پتہ معلوم ہو جاتا تو محبت و خلوص بھرے خطوط ان کے نام سے بھی بھیجا کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے نئے ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست بن کر رہے، اڑوس پڑوس کے لوگوں اور ملنے ملانے والوں سے حسب مراتب ان کی رشتہ داریاں بھی قائم ہو جاتیں۔ اتنا وسیع حلقہ اور ان سب کو اسی اخلاق و محبت کے ساتھ نبھاتے چلے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا، سہیل صاحب کے اندر ایک اور بات بہت اچھی تھی کہ وہ جس طرح سے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے ادیبوں کو بھی بلا تکلف اپنے اسی گھر میں ٹھہرا لیا کرتے! میں جیلانی بانو سے ملنے پہلی بار سہیل صاحب کے گھر گئی تھی کرایہ کا مکان خود گھر والوں کے لیے بھی آرام دہ

نہیں ہوتا ہے اس پر سے کسی مہمان کے لیے جگہ بنانا تو اور بھی دشوار طلب بات تھی۔ مگر ...... سہیل صاحب کے دل میں اتنی جگہ تھی، اتنی وسعتیں تھیں کہ ہماری مدد لینے کو وہ کبھی تیار نہ ہوتے تھے۔ اسی طرح سے رام لعل جب پٹنہ آئے تو سہیل صاحب سے ملے، دن کے وقت تو اختر صاحب یونیورسٹی میں رہتے تھے لیکن میں گھر پر رہا کرتی تھی۔ رام لعل کا خط میرے پاس آیا کہ میں آپ سب لوگوں سے ملنے پٹنہ گیا تھا۔ سہیل صاحب کے ساتھ آپ کے گھر کے گیٹ تک گیا تھا۔ باہر احاطے کی دھوپ میں آپ بہت سے لوگوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سہیل صاحب باہر ہی رک گئے صرف اشارے سے بتادیا کہ آپ کون سی ہیں۔ گیٹ بند کا بند ہی رہا۔ رام لعل کو سہیل صاحب اندر نہ لا سکے، میری زندگی کا کتنا خوبصورت، کس قدر مسرت بخش اور کیسا روشن زمانہ تھا وہ ۔۔ آج تک میرے دل میں ایک کسک اور کبھی کبھی ایک تڑپ سی بھی ہوتی ہے کہ کاش سہیل صاحب رام لعل کو لے کر مجھ سے ملنے کو آجاتے، پھر میں سب کو چھوڑ کر دوسری طرف ان لوگوں سے باتوں میں لگ جاتی سہیل عظیم آبادی اور رام لعل سے مل کر کتنی پیاری پیاری باتیں ہو سکتی تھیں۔ اس وقت تو لکیروں، علامتوں، دھندلکوں اور پرچھائیوں کے بولتے ہوئے دور میں، اب ہمارے اپنے افسانے بھی غیروں جیسے ہی لگتے ہیں۔

۲۶ جنوری کو جب بہادری اور جرأت کے انعامات رتنے کے بعد ماں یا بیویاں لیا کرتی ہیں تو ان تصویروں کو دیکھ کر ہمیشہ میری آنکھیں برسنے لگتی ہیں، اور کئی دنوں تک دل اداس اداس رہتا ہے۔ جب سہیل صاحب بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری بنائے گئے، تو مجھے خبر ملی کہ کئی کمیٹیوں کے ممبروں میں میرا نام بھی رکھا گیا ہے۔ اچانک جرأت و بہادری کے انعامات لینے

والی بدنصیب عورتیں میرے چھلکتے ہوئے آنسوؤں میں تیرتی ہوئی دکھائی دیں اور میں سمجھ گئی کہ اختر صاحب کی جگہ پر مجھے وہ کرسی پیش کی جارہی ہے، دماغ جیسے سُن ہوکر رہ گیا کہاں وہ علم وادب کا بحرِ ذخار اور کہاں میں ۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس عزت افزائی کو قبول نہ کروں لیکن سہیل صاحب نے بہت دیر تک مجھے سمجھایا کہ "آپ ایک لمبے عرصے سے اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں پھر آخر آپ کا اپنا بھی تو کوئی حق ہے" لیکن آج تک اردو اکاڈمی کی میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے جرأت وبہادری کے انعامات لیتی ہوئی بدقسمت عورتیں بے اختیار مجھے یاد آجاتی ہیں۔

سہیل صاحب کو میں نے کبھی کسی جھگڑے میں پڑتے ہوئے نہیں دیکھا وہ بہت ہی صلح جو قسم کے آدمی تھے۔ میں دہلی گئی ہوئی تھی واپس جو آئی تو خبر ملی کہ سہیل صاحب ان دنوں ایک خاص گروپ کے لیے بڑے مخلصانہ طور پر کام کررہے ہیں مجھ کو بڑی حیرت ہوئی کہ اچانک سہیل صاحب میں یہ تبدیلی کیسے ہوگئی۔ یقین کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا میں ان سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے سخت پریشان تھی کہ ایک دن ایک کار میری بہن رضیہ رعنا کے گیٹ پر آکر رکی کچھ جانے پہچانے ہوئے لوگوں میں سہیل صاحب بھی نظر آئے، سب کو لے کر جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تو پتہ چلا کہ یہ وفد اس کام کے لیے میرا تعاون چاہتا ہے ۔ لوگوں نے اپنے طور پر باتیں شروع کردی تھیں، لیکن سہیل صاحب بالکل خاموش تھے۔ مجھے کچھ لوگوں کے خیالات اور ان کی باتوں سے بنیادی اختلاف تھا۔ گفتگو کے بیچ بیچ میں اختر صاحب کے محبت بھرے تذکرے بھی ہوتے رہے۔ سہیل صاحب ساری باتیں بڑی خوشی سے سنتے رہے، جاتے جاتے بڑے پیار سے بولے: "میں نے اختر کی ہمیشہ عزت کی ہے ۔ وہ عزت کیے جانے کے

لائق ہی تھا۔" میں نے انھیں رخصت کرتے ہوئے کہا: "اور سہیل صاحب ساری زندگی میں آپ کی تنظیم کرتی رہی ہوں۔" ایسا لگتا تھا کہ لوگوں نے انھیں تبرک کے طور پر اپنی گاڑی پر بٹھا لیا تھا۔

میں ۱۹۷۹ء کے فروری میں پاکستان جا رہی تھی سہیل صاحب سے ملنے کی بڑی خواہش ہوئی۔ میں نے چاہا کہ ان کے گھر جا کر مل لوں یا پھر انھیں بلوا لوں لیکن خبر ملی کہ سہیل صاحب کی آنکھ کا آپریشن ہوا ہے اور وہ کس نرسنگ ہوم میں داخل ہیں یہ پتہ نہ چل سکا۔ بڑی عمر کے لوگ جب اپنی آنکھیں بنواتے ہیں تو معلوم نہیں کیوں جیسے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کئی لوگوں کو میں جانتی تھی کہ آنکھ کا آپریشن کرانے کے بعد وہ زیادہ عرصے ہمارے درمیان نہیں ٹھہر سکے تھے۔ سہیل صاحب کی آنکھ کے آپریشن کی خبر نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ جب میں ہندوستان کا بارڈر کراس کرنے لگی تو ہمیشہ کی طرح میرے لبوں پر دعائیں کانپنے لگیں: "خدایا سب پیاروں سے خوشیوں کے ساتھ ملا یو!"

اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں پاکستانی ادیب و شاعر بہار کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی عزت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسلام آباد مشہور افسانہ نگاروں اور شاعروں کا بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ اسی جگہ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، صادق حسین، مسعود مفتی جیسے شہرۂ آفاق فنکاروں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ادا بدایونی جو اپنی شادی کے بعد ادا جعفری کے نام سے مشہور شاعرہ ہیں ان سے اگرچہ میں ڈھاکہ میں پہلی بار مل چکی تھی دوبارہ ان سے اور اختر جمال سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

کراچی میں جمیل جالبی صاحب کی خوبصورت کوٹھی میں ادیبوں اور شاعروں کی بڑی اچھی رونقیں ہوتی رہتی تھیں۔ جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، سلمیٰ دمن،

ناجرہ مسرور، اختر حسین رائے پوری، غلام عباس، مختار زمن، ابو الفضل صدیقی
بہت سارے ادیبوں سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، جمیل جالبی صاحب نے
جب پہلی بار ابو الفضل صدیقی سے ملایا تو بہار کا نام سنتے ہی انھوں نے بڑی
بیتابی سے پوچھا کہ ہمارے دوست سہیل عظیم آبادی کیسے ہیں؟ جس اشتیاق سے
وہ پوچھ رہے تھے میں نے بے اختیار ہو کر ان سے پوچھا: "آپ سہیل صاحب
سے مل چکے ہیں؟" کہنے لگے: "ہماری ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی ہے لیکن ان
کے خطوط اتنے برسوں سے پڑھتا رہا ہوں کہ اب مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ
ہماری ایک دوسرے سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی ہے۔" اسی طرح احمد ندیم
قاسمی نے بھی مجھ سے ملتے ہی پوچھا تھا کہ سہیل صاحب اچھے ہیں نا؟

یہ سہیل صاحب کی اسی سادگی اور محبت کا اثر تھا کہ سرحد پار بیٹھے
ہوئے اتنے مشہور ادیبوں کے دلوں میں ان کے لیے خلوص تھا۔

بس گیارہ مہینوں کے بعد جب پٹنہ واپس آئی تو اچانک کسی نے مجھ کو
یہ بتایا کہ سہیل عظیم آبادی اب ہم لوگوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے ہیں۔
میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اختر صاحب کے بعد یہ ستارہ بھی ٹوٹ گیا۔؟
بہار کی پرانی محفل اجڑ کر رہ گئی، گونجتے ہوئے قہقہوں کی مدھم ہوتی ہوئی
آواز اور ان کی سرخیوں والے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹوں کی یادیں بھی رفتہ
رفتہ ماضی کے دھندلکوں کے پردے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ کر رہ جائیں
گی۔

بہار میں علم و ادب کا سورج چڑھتا رہے گا۔ افسانے لکھے جاتے رہیں
گے۔ شاعروں کے نغموں سے فضائیں جگمگاتی رہیں گی --- اور گنگا اسی طرح
بہتی چلی جائے گی۔

اختر اور بنوی چلے گئے ۔۔ سہیل عظیم آبادی اب اس دنیا میں نہیں رہے ۔ کیسا اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا ہے ۔۔ مٹے مٹے سے راستوں کا نشان بھی اب نہیں ملتا ، غم کے اس تپتے ہوئے ریگستان میں اکیلی آبلہ پا میں کب تک چلتی رہوں گی ؟

——

ایک عجیب سی لڑکی

بڑی بھولی بھالی معصوم صورت تھی اس کی ۔ رات کی ہلکی تاریکیاں پھیلتے ہی جب میں جلدی جلدی شوپنگ ختم کر کے گھر واپس جانا چاہ رہی تھی تو وہ گھبرائی گھبرائی سی اسی دکان پر آئی ، اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے وحشت نمایاں لگ رہی تھی ۔ دکانیں بند ہوتی جا رہی ہیں اور ابھی تک مجھے واپسی کے لیے کوئی سواری نہیں مل رہی ہے ۔ اب میں کیا کروں ؟ وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ۔ میں نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کو دیکھا ۔ سچ مچ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی ۔ میرا دل دکھ گیا ۔ "گھبراؤ نہیں میں تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں گی "

" انٹی آپ ۔ آپ کتنی مہربان ہیں " میرے ساتھ چلتی ہوئی وہ میری کار تک آئی ۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہی جیسے اس کو اندر بٹھانا چاہا وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ۔ " چھوڑیے آنٹی ۔ میں کسی طرح چلی جاؤں گی " " ارے کیا تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے ؟ ۔ مجھ کو تو سارا شہر جانتا ہے ۔ دیکھو ضد نہ کرو ۔ بازار میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں لڑکی کیسی بھی ہو اس کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے " اس کے افسردہ چہرے پر خوشی کی اک ہلکی سی جھلک آ گئی اور وہ گاڑی کے اندر میرے

پاس بیٹھ گئی ۔۔ میں اس لڑکی کی ہیجانی کیفیتوں کو خوب محسوس کر رہی تھی، دبی دبی سمٹی سمٹی سی لڑکی اپنے آپ کو نہ جانے کن کن خطرات میں گھری ہوئی سمجھ رہی تھی ۔ میں نے اس کا خوف مٹانے کو پوچھا " تمھارا نام کیا ہے؟"

" وینو ۔ ! "

" تو وینو بیٹی ۔ آپ کہیں پڑھ رہی ہیں ۔ ؟ "

" جی ۔ ام ۔ اے کے پہلے سال میں ہوں "

" اچھا ۔ ! پھر بھی تم اتنی ڈرپوک لڑکی ہو؟ "

" اوہ ! انٹی ۔ وہ ہنس پڑی " رات ہو گئی ہے نا ۔ ؟ پھر میں آپ کو جانتی بھی نہیں تھی " ۔ !

اب اس میں تھوڑا اعتماد آگیا تھا ۔ اس نے اپنے مکان سے کچھ دور ہی گاڑی رکوا دی ۔ " بس انٹی ۔ مجھے اسی جگہ اتار دیں ۔ ہاں اپنا پتہ ضرور بتا دیجئے ۔ کسی دن خاص طور پر شکریہ ادا کرنے آؤں گی " ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے پہلی بار مسکرائی " تھینک یو ۔ ! آنٹی ۔ ! میں آپ کے پاس ضرور کسی دن آؤں گی "

ہفتوں گذر گئے ۔ میں وینو کو بھول چکی تھی کہ اچانک ایک شام کو میرے بیٹے نے آکر کہا " ممی کوئی لڑکی آپ سے ملنے کو آئی ہے ۔ اور جب وہ میرے پاس آئی تو مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ وینو کو اپنا وعدہ یاد تھا ۔ وہ ہنستی مسکراتی پہلی وینو سے مختلف لگ رہی تھی ۔ خوبصورت آنکھوں کا انداز آج بدلا ہوا سا تھا ۔ وہ ذرا جھک کر نمستے کرتی بس ایک مورتی جیسی لگتی تھی ۔ وہ میرے قریب ہی آکر بیٹھ گئی ۔ اس کے انگ انگ سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں ۔

"آنٹی! مجھ کو آپ کا گھر ــــ آپ کا پھولوں سے سجا ہوا کمپونڈ۔ لہکتا ہوا سبزے کا یہ لان بے حد اچھا لگا۔ کتنی خوشبو ہے آپ کے گھر میں، آپ کی ذات میں ـــ اور آنٹی ـــ مجھ کو آپ کا بیٹا بھی بہت اچھا لگا۔

"جی ہاں بہت اچھا لگا۔! اس کی بھی اپنی ایک الگ خوشبو ہے۔ ہے نا آنٹی؟۔میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے اس بھولی بھالی لڑکی کو دیکھا ــــ اب مجھے وہ کافی گہری دکھائی دے رہی تھی۔

"ڈینو! تم خود بہت اچھی لڑکی ہو اسی لیے تم کو بھی اچھے لگتے" ہیں۔ لگتا ہے کہ تمھیں بھی پھولوں سے پیار ہے، یہ شوق میرے اسی بیٹے احمر کا ہی۔ اس کو تو پھولوں سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے' کالج سے جب فرصت ملے' باغبانی کرنے بیٹھ جاتا ہے۔"

"بس ــ تو آنٹی ــ! اسی لیے پھولوں کی خوشبو آپ لوگوں میں بس کر رہ گئی ہے۔"

وہ لڑکی جب تک رہی اسی طرح کی باتیں کرتی چلی گئی۔ احمر جہاں پر بھی ہوتا، اس کی نگاہوں کا مرکز بن جاتا۔ میرے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے احمر کو پکارا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا، میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا تاکہ وہ جی بھر کے اُسے دیکھ لے، چھُپی چھُپی نگاہوں سے تکتے چلے جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ احمر نے ڈینو کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر اس لڑکی کے چہرے پر انار کی کلیوں جیسا رنگ چھلک رہا تھا۔ اور ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت اس پر چھا رہی تھی۔

پھر وہ اچانک اٹھ کر جانے کی جلدی کرنے لگی۔ مجھ کو پرنام کیا اور احمر کے آگے ہاتھوں کو باندھے ہوئے بے اختیار ایک پجارن کی طرح جھک گئی۔ جاتے جاتے پھولوں پر جھکی اس کی خوشبوؤں کو سونگھتی رہی۔ پھر گلاب کی چند کلیوں کو اپنے جوڑے میں سجا کے دور تک مڑ مڑ کر تکتی ہوئی چلی گئی۔

مہینوں بعد وہ اسی طرح اچانک آجاتی۔ ابھی تو بالکل بدلی بدلی سی اور کبھی وہ بے حد قریب سی لگتی۔ بعض دفعہ اس کے چہرے پر اجنبیت سی چھائی رہتی۔ اس کو ایسے عالم میں دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی۔ یہ لڑکی قریب ہوتے ہوئے بھی پھر اتنی دور کیوں نظر آنے لگتی ہے؟۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ آنا جانا ہمارے گھر میں قائم رکھے۔ اس کے جذبات و احساسات کی الجھی ہوئی ڈوریں مجھے بھی الجھنوں میں ڈال دیا کرتی تھیں، اپنے چہرے پر کئی نقابیں ڈالے رکھنے والی اس لڑکی کو میں کبھی سمجھ نہ سکی تھی، وہ میرے گھر کی لڑکیوں لڑکوں سے بڑے خلوص سے ملتی بچوں کے سوئٹر بُن بُن کر انھیں پہناتی مگر جب کوئی لڑکی اس کو اپنے قریب سے قریب لانا چاہتی تو وہ اچانک اپنے خول میں سمٹ کر بہت دور نظر آنے لگتی۔ وہ اس طرح سے چوکنی ہو جاتی جیسے اس کو کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ اور پتہ نہیں وہ ان غیر مانوس چہروں کے درمیان کیسے پھنس کر رہ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری جستجو ہوتی۔ جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ جہاں جہاں اس نے احمر کو دیکھا تھا اس کی نگاہیں انہی جگہوں پر دیر تک بھٹکتی رہتیں۔ کبھی کبھی وہ بڑے اداس انداز میں کہتی۔ "آنٹی۔ آپ کا بیٹا تو یہاں سے بہت دور چلا گیا ہے مگر اس کی خوشبو ہر طرف بسی رہ گئی ہے۔ کیا

آپ کو وہ خوشبو محسوس نہیں ہوتی ــــ ؟ میرا من تو اس کی خوشبوؤں سے ہر گھڑی بسا رہتا ہے ــ!" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جھک جاتی ــ! اور میں اس کی باتوں کو سن کر سوچنے لگتی تھی کہ یہ لڑکی کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہے۔

ڈینو گھر بھر کے لیے ایک معمہ بن چکی تھی۔ لاینحل معمہ ــ وہ کیا چاہتی تھی پتہ نہیں ــ کبھی کبھی تو وہ اتنی اپنی لگتی کہ جی چاہتا اُسے کلیجے میں بٹھالوں اس کا خلوص ــ اس کا پیار دیکھتے ہوئے یقین نہ آتا تھا کہ ڈینو کی آنکھوں میں کبھی اجنبیت کے سائے بھی جھلک آسکتے ہیں۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اصلی ڈینو کہاں غائب ہو جاتی ہے اور نقلی ڈینو ہمارے درمیان آجاتی ہے ایک بار میں شوپنگ سنٹر گئی ہوئی تھی وہاں کئی عورتوں کے جھرمٹ میں ڈینو پہلے سے موجود تھی، اس نے مجھے دوکان کے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اپنی انگلی دائیں بائیں چپکے سے ہلاتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ اتنی جلدی کیا کہ میں حیران سی رہ گئی ــ میری آنکھوں میں پہچان کی خوشی اور اچانک ملنے کی مسکراہٹ یکدم مٹ کر رہ گئی۔ اس عجیب سی لڑکی نے مجھ کو بھی ایک تماشہ بنا رکھا تھا ــ!

ڈینو اپنے ساتھ کی عورتوں میں بڑے مطمئن انداز سے چیزوں کی پسند اور ناپسند پر گفتگو کرتی رہی اور میری طرف بھی کبھی وہ ایسی بے پرواہ اور سپاٹ نگاہوں سے دیکھ لیا کرتی تھی جیسے اس کی آنکھوں میں پہچان کی روشنی کبھی تھی ہی نہیں ــ یا شائد اس کے اشارے نے خود مجھ کو اس طرح بدل دیا تھا جس کو وہ کبھی جانتی بھی نہ تھی ــ!

ہم لوگ یہ تو سن چکے تھے کہ وہ ایک انجینیر کی بیٹی ہے، پڑھی لکھی،

ایک اچھے گھرانے کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس کی اپنی شخصیت کئی ایسے پردوں میں چھپی ہوئی تھی جس کو کوئی سمجھ نہ سکتا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر کون سی گرہ ایسی پڑ گئی تھی، جو کبھی کبھی اپنے آپ کو وہ اتنا سمیٹ لیا کرتی تھی کہ خود اپنے لیے بھی ایک اجنبی بن جاتی ۔ احمر نے پہلی بار اس کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ نفسیاتی طور پر وہ ایک اب نارمل لڑکی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس رنگ میں چھپانا چاہتی ہے تاکہ لوگ اس کو تلاش کرتے پھریں لیکن میرے دل میں ایک عورت اور ایک ماں کے ناطے ایسی ممتا بھری تھی کہ اس کے بدلتے ہوئے چہرے کا رنگ دیکھ کر میرا جی ڈوب جاتا تھا۔ کھوئی کھوئی آنکھوں کا کرب مجھ کو بے چین کر دیتا تھا۔ اور میری دلی تڑپ یہی ہوتی کہ وہ مجھ سے اپنے دل کی ساری باتیں بتا دے۔ مگر کبھی کبھی وہ مہکتے پھول کی طرح شاداب اور کھلی ہوئی کلیوں کی طرح بھی نظر آتی جس کو شبنم کے قطروں نے تر و تازہ بنا دیا ہو۔

ایک دن میں اکیلی برآمدے میں بیٹھی ٹونگ کر رہی تھی کہ اچانک گھبرائی گھبرائی سی وینو میرے پاس تیزی سے آئی ۔" آنٹی! ابھی کوئی لڑکا مجھے ڈھونڈتا ہوا اگر آئے تو کہہ دیجئے گا کہ وینو یہاں نہیں ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ گورا ـــــ گورا خوبصورت ـــــ لڑکا۔"

"ـــــ اچھا اچھا میں کہہ دوں گی تم اندر جا کر آرام سے بیٹھو"ـــــ!

وہ افسردہ چالوں سے چلتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ مجھ کو یہ کھیل اچھا نہیں لگا ـــــ یہ لڑکی خواہ مخواہ اپنی الجھنوں میں مجھ کو بھی شامل کرتی جا رہی ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک خوبصورت ـــــ نوجوان وینو کو ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آگیا۔ "آنٹی! وینو آئی ہے؟"

ابھی میں اس کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ پچھلے دروازے سے وینو ہنسی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی —

"اجی جناب! میں یہاں ہوں —!" پھر وہ دونوں ہنستے ہوئے اس بے پروائی سے چلے گئے جیسے یہاں پر ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا وجود تھا ہی نہیں —!

کتنے سال ہو گئے۔ وینو کہیں نظر نہیں آئی۔ جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے، تو میں بے اختیار سوچنے لگتی ہوں کہ وہ کیسی عجیب لڑکی تھی —!

— —

فیس پاؤڈر

شادیوں کے ہنگامے، بناؤ سنگار۔ طرح طرح کی خیال و نظر رکھنے والی خواتین کا جمگھٹا۔ قسم قسم کے فقرے، چبھتی ہوئی تنقیدیں۔ دبی دبی مسکراہٹیں۔ اور اشارے کرتی ہوئی نگاہیں۔! مجھے ان سارے جھمیلوں سے بڑی الجھن ہوا کرتی تھی۔ وہی صدیوں پرانے ریت رسمیں۔ ڈھولک کی وہی اپنی ایک گونج۔ گیتوں کے وہی مخصوص لہجے۔ وہی سنی سنائی دھنیں جی چاہتا کبھی تو کوئی نیا پن ہوتا۔ مگر یہ بھلا کب ممکن تھا۔ میں نے بڑی کوششیں اور منتیں کیں، طبیعت کی خرابی کا بہانہ پیش کیا لیکن یہ شادی اتنے قریبی دوستوں کے یہاں تھی کہ آخر مجبور ہو کر رہ گئی۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ بڑی بے دلی سے اٹھی۔ کپڑوں کا انتخاب بھی اب کچھ آسان نہ رہا تھا۔ جب کبھی توس قزح کے رنگ زمین پر اتر آتے تھے اس کا زمانہ بیت چکا تھا۔ اب تو سوبر۔ سنجیدہ پُروقار کپڑوں کو ڈھونڈتے ہوئے بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ ڈرائیور دھیرے دھیرے ہارن بجا کر مجھے چلنے کی یاد دہانی کرا رہا تھا۔ میں نے آئینہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے بڑی پریشان نگاہوں سے اپنے آپ کو دیکھا۔

"کیا۔؟ یہ میں تھی۔"؟ اچانک میری نگاہ سنگار میز کے ایک کنارے پر رکھی رنگین تصویر پر گئی۔ تو! پھر یہ تصویر کس کی تھی؟۔ گلاب سا

کھلا ہوا چہرہ ـــــ شوخیوں کا سا انداز ـــــ! زندگی اور مسرتوں کی کرنوں سے سجی ہوئی تصویر کا سراپا دعوت نظر دے رہا تھا ـــــ تصویر کو دیکھتے ہی احساس ہو رہا تھا جیسے تمناؤں کے سارے غنچے بہار کی نغمہ بار لہروں سے یکدم کھل اٹھے ہیں۔ حیات و کائنات کی ساری دل کشی شیشے کے اندر اسی چوکھٹے میں سمٹ آئی تھی ـــــ یہ لڑکی جو بھی تھی اس کو دیکھتے ہی اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی ریشمی رنگین ساڑی کا ہلکا سا پلو بھی اس کے شانے پر بوجھ لگ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی نظریں تصویر کی طرف سے پھیر لیں ـــــ آئینہ میرے سامنے تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اپنی بے چہرگی کے ساتھ میں کسی دوسرے کی صورت دیکھ رہی ہوں۔ وقت اور زمانے کے بوجھ نے خوبصورت آنکھوں کو جھکا دیا تھا۔ بیتے دنوں کی یادیں لکیریں بن کر لب و رخسار پر نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ چمکتی ہوئی پیشانی گردشِ ایام کی کچھ شکنوں کو یادگار بنا چکی تھی۔ میں نے عینک اتار کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھا اس وقت میرے ابھرے رگوں والے ہاتھوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں ـــــ ایک بار پھر گاڑی کا ہارن ہلکے سے بجا، میں نے گھبرا کر گھڑی دیکھی، خاصی دیر ہو چکی تھی، جلدی جلدی سفید ہوتے ہوئے بالوں کا بے دھیانی سے جوڑا بنایا، چہرے پر لوشن لگا کر فیس پوڈر تلاش کرنے لگی۔ سنگار میز کا کونہ کونہ ڈھونڈ لیا، پتہ نہیں فیس پوڈر کہاں رکھ دیا تھا الماری کی ساری چیزوں کو اٹھا کر دیکھا، اپنا بیگ الٹ کر رکھ دیا مگر فیس پوڈر نجانے پر لگا کر کہاں اڑ گیا تھا۔ میں نے بڑی بے چارگی سے اپنا سوکھا اور مرجھایا ہوا چہرہ آئینہ میں دیکھا، لوشن کے بعد فیس پوڈر چہرے کی ہلکی ہلکی سی لکیروں کو بڑی صفائی سے اپنے دامن میں چھپا لیتا ہے، چہرہ اگر دلکشی سے سنوارا جائے تو کالے بالوں کے ساتھ کچھ سفید

ملے جلے ہوئے بال بہت پُروقار لگتے ہیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی مجبور سانس کھینچتے ہوئے کال بل پر انگلی رکھ دی۔ ملازم دوڑتا ہوا آیا۔ مجھے جانے کے لیے تیار دیکھتا ہوا بولا "گاڑی لگی ہے حضور"۔

بڑی بے بس اور چور نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے میں نے کہا "ڈرائیور سے کہہ دو — میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ گاڑی بند کر دیجیے"۔

اور میں اُن ہی کپڑوں میں اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ بعض دفعہ انسان بھی کتنا سطحی اور کتنا بھولا بن جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو خواہ مخواہ کتنا مجبور بنا دیتا ہے۔ اگرچہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم اپنے کو بدلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر پھر بھی کچھ ایسے پل ہماری اَنا سے چمٹے ہوئے رہ جاتے ہیں جو زندگی بھر ہمیں چین نہیں لینے دیتے۔ آنسوؤں کے چند قطرے میرے تکیہ میں جذب ہو گئے۔ اور اسی کے ساتھ میرے ذہن میں بے اختیار اور بالکل اچانک طور پر بہت دنوں کی ایک یاد جھلک آئی۔ اسی طرح شادی کی دھوم مچی تھی۔ دَر و دیوار سے نغمے پھوٹ رہے تھے، نگاہوں کی بجلیوں اور مسکراہٹوں کی خوشبوؤں سے فضا مدہوش ہو رہی تھی، آسمان کے ستارے زمین پر اُتر آئے تھے اور رنگینیوں کی محرابیں ذہن و نظر کے سامنے زندگی کا مکمل حُسن پیش کر رہی تھیں۔ شادی کے گھر میں خوشیوں خوشبوؤں اور مسرتوں کی ہلچل مچی تھی۔ زمانہ اور وقت جب انسان کے دلوں کو خوشیوں، تمناؤں — اور محبتوں اور پیار کی انتہا اور زندگی کی سرمستیوں سے بھر دیتی ہیں تو ہر بیتنے والا لمحہ جاودان بن جاتا ہے۔

شادی کا گھر مہمان عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا، آداب محفل کے ساتھ رونقیں عروج پر تھیں۔ شہر کے مشہور بیرسٹر صاحب کی چہیتی بیگم جس وقت کار سے اتر کر مجلس میں آئیں تو ہر کسی کی نگاہیں انہی پر جم کر رہ گئیں۔ خوبصورت چہرے کے ساتھ ہی وہ بھی سجائی دلہن کی طرح تھیں۔ آنکھوں میں نرمی۔ نگاہوں میں خلوص کی روشنی اور لبوں پر بڑی شاداب مسکراہٹ۔ عینک کے پیچھے سے دکھتی ہوئی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں مخمور نظر آرہی تھیں۔ چند عورتوں نے ایک ایک دوسرے سے جھک کر سرگوشیوں میں کچھ باتیں کیں۔ کسی کی نگاہوں میں طنز کی ہلکی ہلکی چبھن بھی صاف دکھ رہی تھی۔ میں ذرا دور کھڑی اس اشارے کنائے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ہمارے گھر کی یہ مہمان خصوصی تھیں۔ میں نے خالہ امّی سے جا کر کہا۔ آپ اپنے مہمانوں کو سنبھالیے۔ دوسرے کام ہوتے رہیں گے۔ اس شہر بھر میں بیرسٹر صاحب کی اپنی بیگم سے بیتابانہ محبت ایک مثالی بات تھی۔ شاندار محل جیسی کوٹھی بیگم کے نام تھی۔ جن کے لاتعداد خوبصورت بڑے بڑے کمروں میں بیگم کی قدِ آدم رنگین تصویریں تھیں، ساری تصویروں کا اپنا ایک الگ الگ رُوپ تھا۔ ہنستی، مسکراتی، سوچتی، لکھتی، زندگی کی ہر ایک ادا ان تصویروں میں اُتاری جا چکی تھی۔ اتنی شاہانہ زندگی، اتنے پیار و محبت، اتنے حُسن و آرائش کے بعد بھی یہ محل نما کوٹھی سنسان ہی رہی تھی۔ کوئی بچہ سنگِ مرمر کے فرشوں پر گھٹنوں کے بل کبھی نہیں چلا تھا۔ یہ سُرخ رنگ کی کوٹھی شاید تمناؤں کے لہو سے ہی رنگین تھی۔

بیرسٹر صاحب کی مسرّتوں کا بس ایک ہی مرکز تھا۔ وہ اجلاس پر بھی بیچین بیچین سے رہتے، گھر لوٹتے ہی بیگم کو دیکھ لینے پر انھیں سکون

مل جاتا تھا - وقت گزرتا چلا گیا - مگر ان دونوں کا پیار اپنی جگہ پر تھا - وہ ایک دوسرے کے سہارے چلتے چلے جا رہے تھے - بہار کے دن بیت گئے اور خزاں کا دور آنے پر بھی شاید انھیں احساس نہ ہوا ہو گا کیونکہ رنگین، ہنستی مسکراتی شباب کی بجلیاں گراتی ہوئی تصویریں، دم بھر کے لیے ان کے تھکے ہوئے جسموں کو تازگی عطا کر دیا کرتی ہوں گی اور دل امنگوں سے خالی ہوتے ہوئے بھی پیار کے نشے سے جھوم اٹھتے ہوں گے - کوٹھی کے سناٹے نے بیگم کو ہمیشہ سے دہلائے رکھا تھا اور وہ اس بات کو سمجھتی تھیں کہ خوبصورتی کا سایہ جب ڈھلنے لگتا ہے تو چاہنے والی نگاہوں کو بدلتے دیر نہیں لگتی، اسی لیے وہ اپنے حسن اور نزاکتوں کو دیکھتی ہوئی انھیں برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتی تھیں - اگر اس محل کے اندر ان کے حسن و جمال کی لہریں تصویروں میں ہر طرف جھلکتی نظر نہ آتیں تو شاید وہ اتنی مضطرب نہ ہوتیں - مگر وہ بیچاری کیا کر سکتی تھیں اپنا اختیار ہی کون سا تھا؟ کبھی کبھی ان کے دل میں اک شکایت سے بھری ہوئی چبھن اٹھتی - اگر ان کے حسن کے چند ٹکڑے اس محل میں ہر طرف ہنستے مسکراتے چہلیں کرتے پھرتے تو اس وقت ان کا اعتماد قائم رہتا، چاند سے زیادہ حسین اس کی چاندنی ہوتی ہے - مگر فطرت نے اُس چاندنی سے انھیں محروم رکھا تھا - اور حسن و جوانی تو ایک عارضی چیز تھی — !

بیرسٹر صاحب کی بیگم صاحبہ نے دلھن کے مہندی لگے ہاتھوں کو اپنے ہیروں کی انگوٹھیوں سے بھری ہوئی انگلیوں سے چھوا " کتنے نازک کتنے پیارے ہیں یہ مہندی لگے ہاتھ " انھوں نے اس سُرخ ہتھیلی کو بڑے پیار سے سونگھا -

ہے دلھن کی خوشبو سے بڑی دنیا کی اور کوئی خوشبو نہیں ہے۔"

وہ بڑے خلوص اور سادگی سے بولیں۔

شادی کی ساری رات کا ہنگامہ چھینتی بیگم نے بڑی خوشی سے اپنی آنکھوں میں کاٹ دیا اور جب صبح کے ہلکے دھندلکے میں دلھن رخصت ہوگئی تب بیگم نے اس کمرے میں قدم رکھا جو ان کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔

سارے لوگ تھک کر نڈھال ہو رہے تھے۔ ایک لڑکی کی رخصتی نے اس بھرے گھر کو اداس کر دیا تھا۔

شادی کا گھر ـــ دنیا بھر کے جھمیلوں سے اٹا پڑا تھا۔ سب ہی لوگ مصروف تھے صبح ہو چکی تھی ناشتے کی دھوما دھوم مچی ہوئی تھی۔ گھر کی صفائی چیزوں کی ترتیب، ناشتے چائے کی مانگ۔ خالہ امی کے ساتھ ہم سبھی لڑکیاں گھبرائے گھبرائے سے کام میں لگے تھے۔ بیگم صاحبہ کی آیا پریشان پریشان سی کچھ ڈھونڈتی پھر رہی تھی ـــ وہ کسی چیز کو تلاش کر رہی تھی۔ آخر تھک کر ہمارے پاس آئی "بیگم صاحب کا ہاتھ میں پکڑنے والا بیگ کہیں کھو گیا ہے، کھوجتے کھوجتے تھک گئے" وہ بڑی تہذیب سے بولی۔

"ارے! کہاں رکھ دیا تھا بیگ۔ کہیں روپے، پیسے، زیور وغیرہ تو نہ تھے اس میں"؟ خالہ امی نے گھبرا کر کہا۔

ـــ "گہنا جیور تو نہ تھا حضور ـــ مگر بیگم صاحب کا تو اصلی پیچ تھی بیگ نگوڑے میں" آیا نے اداس لہجے میں کہا۔

"تو آخر کیا تھا بھئی۔؟" "ارے۔ کا رہے گا اُوہی ـــ منھو آنکھ

میں لگوے والا تھا سب "

" میں تو ڈر گئی تھی کہ پتہ نہیں کتنے کا نقصان ہو گیا ہو گا۔ شکر ہے کہ روپے زیور نہیں تھے اس میں ۔ شادی کا گھر۔ کیا پتہ کس کی نیّت کیسی ہو۔؟ خالہ امی نے خوش ہو کر کہا۔ آیا پھر اپنی بیگم صاجبہ کے پاس سے واپس آکر بولی۔

" میری بیگم صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ لوگ کے پاس پھیس پوڈر ہوگا، تھوڑا سا ان کو چاہیے "

فیس پوڈر ۔۔۔ ؟ کیسا ہوتا ہے فیس پوڈر۔ نا بی بی ۔ آج تک تو یہ آوڈر پوڈر میں نے لگایا ہی نہیں ہے۔ ہاں اِن لڑکیوں سے پوچھ لو" خالہ امّی بڑی سادگی سے بولیں۔

خالہ امّی نے ہم لوگوں کو پکارا " دیکھو بیٹی ۔ بیگم صاجبہ کو ذرا فیس پوڈر چاہیے ۔ اگر تم لوگوں کے پاس ہو تو آیا بی کو دے دو "

ایک ہی ساتھ ہمارے شریر لبوں پر ہنسی تڑپنے کو مچل مچل اُٹھی ۔۔ مگر ہم نے بمشکل اپنے چہروں کو معصوم بناتے ہوئے کہا " فیس پوڈر ۔ ؟ ہم لوگ کہاں لگاتے ہیں " ۔ ؟

اور جب بڑے اہتمام سے ٹرے میں سجا کر بیگم بیگم صاجبہ کا ناشتہ ان کے کمرے میں لے جایا گیا تو کمرہ خالی تھا ۔ بیگم صاجبہ پچھلے دروازے سے اپنی کار پر رخصت ہو چکی تھیں ۔

--

اسٹیل والا

ایسی کڑاکے کی سردی میں مُوسلا دھار بارش نے کئی دنوں سے ہر طرف اک ویرانی سی پھیلا رکھی تھی۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے وقت میں کمرے کے دروازے اور دریچوں کو بند کر دینے کے بعد ریشمی دبیز پردوں کو گرا کر، لحاف اور کمبلوں میں دبکے ہوئے گرم گرم چائے اور کافی پینے میں جو مزا آتا ہے وہ شیما اور نوشی کے ساتھ ان کی سہیلیاں ہی جانتی تھیں۔ بھنے ہوئے کا جو اور گرما گرم خوشبودار پکوڑیاں ساون کی جھڑی سے نکل کر اب ٹھنڈی برف آلود موسم کی چیزیں بن گئی تھیں۔ اور تاش کے سرسراتے ہوئے چکنے پتّوں نے لوگوں کو گرد و پیش سے بے خبر کر دیا تھا۔

نوشی نے ہلکی سی جھرجھری لی "بھئی اب تو حد ہو گئی۔ پورے تین دن ہو گئے بارش ہوتے ہوئے۔"

"پھر تمھارا کیا بگڑتا ہے۔؟ مزے میں ہیٹر جلائے گرم گرم کافی پیتی ہوئی رمی کھیل رہی ہو۔"

"مگر! بھئی دیکھو تو کہیں ایسی بھی بارش ہوتی ہے؟ جیسے بادلوں پر دیوانگی چھا گئی ہو۔ یہ گرج۔ یہ چمک۔ یہ کڑاکے۔ یا اللہ۔ ساری

زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے "

" ارے! چلو انجوائے کرو۔ زندگی بس ایک ہی بار تو ملتی ہے۔ غالب بچارے دنیا سے روتے ہی چلے گئے کہ "لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں" برج کا یہ جادو ہوش کو معطل کر دیتا ہے۔ برج کھیلتے ہوئے لوگ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ شیما اپنے مہمانوں کے حوصلے بڑھا رہی تھی۔

" بتیس برج اور رمی کے سوا اور کچھ بھی یاد نہ رہا۔ ہائے میرے گلابوں کی نازک پنکھڑیوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔؟ فلاور شو میں اب تو بھیجنے کے لائق بھی نہ رہیں گے "

شیما جھکے ریر برسے جا رہے تھے لہک کر بولی " نیلما رانی۔ تم کو پھولوں کے سوا اور بھی کچھ یاد ہے؟ پھولوں کا دیوتا۔؟ گلابوں کا راجہ؟"

نیلما کھکھلا کر ہنس پڑی "۔ارے بھئی۔! فون پر ان کی خیریت مل چکی ہے مگر اس اللہ کے بندے نے بھی میرے پھولوں کا کچھ نہ بتایا"

" اچھا اب دیکھو۔ اپنے ہائے دائے سے ہماری یہ جمی جمائی پارٹی کو مت بگاڑو۔ کیسی پیاری محفل جمی ہے۔ آؤ۔! میں تم کو بتاؤں کہ تمھارے پھولوں پہ کیا گذر گئی ہوگی۔ میرا یہ دریچہ بس ذرا سا کھول کر نیچے دیکھو۔ جو میرے گلستاں کا حال ہو رہا ہے نا؟ وہی کچھ تمھارے گلشن پر بھی بیت رہی ہوگی۔ اب چھوڑ گل و بلبل کے فسانے۔ سب کچھ بھلا کر بارش کے شور میں صرف اپنے ہاتھوں کے پتّے یاد رکھو۔ اور زمین و آسمان کے سارے چکروں کو بھول جاؤ "

" اور بھئی جب تاش کھیلتے کھیلتے طبیعت اوب جائے تو پھر وی۔سی۔آر پر اپنی پسند کی فلم لگا لو " نوشیں نے نیلما کو چھیڑا جو بے حد

بور ہو رہی تھی "۔

پانی کی بوچھاریں کبھی ہلکی اور کبھی تیز پڑ رہی تھیں۔ مسلسل بارش نے ہر طرف ایک ویرانی سی پھیلا رکھی تھی ــــ سڑکیں اُجاڑ پڑی تھیں۔ ملازموں کی منڈلی نے بھی کچن میں اپنی مجلس جما رکھی تھی۔ چائے اور کافی کی جتنی کشتیاں بیگم صاحبانوں کی طرف جاتی رہی تھیں۔ اتنی تو نہیں پھر بھی گرم چائے کے پیالے اور مگ کچن میں بھی بٹ رہے تھے۔ مگر اس جگہ چہروں پر اداسیاں چھا رہی تھیں فکرمند آنکھوں میں اضطراب جھلک رہا تھا۔ بچوں نے بھی الگ ایک کمرے میں اپنے کھلونوں اور کھیلوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔

تین دنوں سے دن دوپہر اور رات ایک ہی طرح بس دھندلکوں میں گذرتے جا رہے تھے۔ چمکتا ہوا آفتاب بادلوں کے گہرے پردوں میں جا چھپا تھا۔ برفیلی ہواؤں سے جسم کی ہڈیاں تک کانپ اُٹھتی تھیں۔

بھُنی ہوئی کھچڑی، مرغ کے رزالے اور شامی کباب بارش میں خاص مزہ دیتے ہیں۔ ایسا اچھا کھانا کھانے کے بعد وی۔سی۔آر پر فلم دیکھی جانے لگی۔ خدا کا شکر تھا کہ لائٹ آج بہت اچھی تھی۔ شام ہوتے ہوتے ہواؤں کے تیز جھونکے چلنے لگے، سردی اور بھی چمک اٹھی تھی۔ آسمان کے کنارے پر ہلکا سا رنگ اُبھر آیا تھا۔ پانی کا زور شاید اب ٹوٹ رہا تھا۔

کمرے کے اندر برج کی پارٹی بھی فلم دیکھتی ہوئی تھک کر چور لگ رہی تھی۔ بچوں نے کمرے سے نکل کر ڈری ڈری مگر شوخ نگاہوں سے آسمان کو دیکھا اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ تین دنوں سے گھر کے اندر وہ بچارے قید ہو کر رہ گئے تھے۔

گرج، کڑک اور چمک کے بغیر تیز ہواؤں میں رات سکون سے گزر گئی۔ دُھلی دھلائی صبح ہلکی ہلکی سنہری دھوپ میں بے حد نکھری ہوئی تھی۔ بچّوں نے شور مچاتے ہوئے نئی صبح کا خیر مقدم کیا۔ گھونسلوں سے بھی چڑیوں نے اسی طرح بہت سویرے فضا میں اڑتے ہوئے حسین صبح کو خوش آمدید کہا ہوگا۔

سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔ اُجالا جاگ اٹھا تھا، دُھند مٹ چکی تھی۔ بُجھے بُجھے چہروں پر سردی سے کانپتے ہوئے بھی رونقیں چھا گئی تھیں۔ درو دیوار بھیگے بھیگے سے ابھی تک سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔ درختوں کے دُھلے ہوئے پتوں پر بڑا پیارا نکھار آگیا تھا۔

نشیبی جگہوں پر سیلاب جیسا لگ رہا تھا پھُونس کی جھونپڑیوں پر تو ایک آفت سی آگئی تھی، ہر طرف سے پانی کی بوچھاروں نے ان کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

شیما کی سہیلیاں گھر کے اندر قید و بند سے ایسی اکتا چکی تھیں کہ جیسے ہی احاطے میں ہلکی سی دھوپ نظر آئی وہ سب کی سب نیچے احاطے میں چلی آئیں۔ سرد ہوائیں بھی پُر لطف لگ رہی تھیں ایسی انمول اور اللہ آمیں کی دھوپ میں بھی ملازموں نے گارڈن چھتری لگا رکھی تھی۔

"ہائے کیسی پیاری پیاری دھوپ ہے۔" شینو سچ مچ ایسی مسلسل بارش سے پانی پانی ہو چکی تھی۔

"ارے شیما۔ ہائے تمھارے ان بیچارے پھولوں پر تو اک قیامت ہی آگئی ہے۔" نوشیں نے گلاب کی بکھری ہوئی پنکھڑیوں اور پانی کی بوچھار سے جھکی جھکی شاخوں کو دیکھ کر کہا۔

"اور یہ دیکھو۔ ڈیلیا کی اتنی بڑی بڑی کلیاں ایسے جھک گئی ہیں جیسے ان کی گردنیں ٹوٹ گئی ہوں۔" نیلما کے لہجے میں درد بھرا تھا۔

شیما نے بڑے دکھ سے اپنے چہیتے پھولوں کے ان بڈوں کو دیکھا۔ جن میں کھلتے ہوئے پھولوں کیلئے ہر سال وہ فرسٹ پرائز لیا کرتی تھی۔

"چلو۔! یہ بھی زندگی کا ایک رُخ ہے"۔ شیما کی آواز میں اک درد تھا۔

"لیکن! میں تو اس کو حادثاتی رُخ کہوں گی۔" نوشیں سے چپ نہ رہا گیا۔

شیما سب کے اداس چہروں کو دیکھتے ہوئے کافی سپ کرنے لگی۔ "پھولوں کی بربادی کا غم ہم کافی کی پیالیوں میں ہی بھلا سکتے ہیں۔" شیما نے اپنی دوستوں کو بہلانا چاہا۔

بچوں کے شور اور دلچسپ باتوں کی محویت میں بھی اسٹیل کے برتن والے کی تیز آواز سامنے سڑک پر گونجی۔ "اسٹیل والا۔" اور شیما ہڑبڑا کر بول اٹھی۔

ارے ارے بلاؤ بھئی۔ اسٹیل والے کو بلاؤ۔"

شینو ہنس پڑی۔ "بڑی بیقراری ہے۔ بھلا کب سے اس کی راہ تک رہی تھیں۔ ذرا دیکھوں تو کون ذات شریف ہیں۔" شیما کھکھلا کر ہنس پڑی بہت دنوں سے بیکار کپڑے پڑے ہوئے ہیں چاہتی ہوں انھیں ذرا مصرف میں لے آؤں۔ پہلے تو جیسے تیسے لوگوں کو دیتی رہتی تھی مگر اب بڑی اچھی صورت نکل آئی ہے۔"

اسٹیل والے نے آتے ہی جھلملاتے اور چمکتے ہوئے برتنوں کو نکال کر پھیلا دیا۔ "یہ ڈونگے ہیں جی۔ یہ رائس باول۔ یہ جگ۔ یہ پلیٹیں۔ یہ دیگچی یہ ٹرے۔ اور یہ ٹفن کیریئر۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جی بولیے کیا چاہیے آپ کو۔"

یسما ایک خوبصورت سا ڈونگا اٹھا کر بولی۔" اس میں انڈے کا حلوہ کتنا اچھا لگے گا۔" کتنے کپڑے لوگے بھئی اس کے۔؟

" دس کپڑے لوں گا جی۔ اس سے کم نہیں۔" اسٹیل والے نے شیما کی نگاہوں میں ڈونگے کی طلب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سوئٹر۔ پینٹ۔ گرم سوٹ اور اسی طرح کی چیزیں۔ سردیوں کے کپڑے لیتا ہوں ابھی اسی کا سمے ہے۔"

یسما نے اپنے ایک ملازم سے پرانے گرم کپڑوں کا ایک بڑا سا گٹھر منگایا۔ پھر اس کو یاد آیا کہ اوپر کا کام کرنے والی عورت پاربتی کئی دنوں سے نہیں آرہی ہے، وہ ملازم سے بولی کہ پاربتی کو ابھی ساتھ لے کر آئے۔ کہنا بارشں میں کام بند نہیں ہوتے بلکہ اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اس کو خود ہی خیال ہونا چاہیے تھا۔"

اسٹیل کے برتن پسند کر کر کے الگ رکھے جاتے رہے۔ کپڑوں کی ڈھیر میں سے قمیص، سوئٹر، پینٹ چھوٹے اور بڑے گرم کوٹ۔ پرانی بدرنگ شالیں۔ ساڑیاں۔ پلنگ کی چادریں چھانٹ چھانٹ کر نکالے جاتے رہے۔ شینو کو یہ تماشہ اچھا نہیں لگ رہا تھا خواہ مخواہ کا جھیلا لگا ہوا تھا۔ اس نے بیزار نگاہوں سے اسٹیل والے کو دیکھا بھئی شیما۔ مجھ کو یہ ہیر پھیر، ادل بدل والی باتیں ذرا اچھی نہیں لگتی ہیں، ان کپڑوں پر تو غریبوں کا حق ہوتا ہے کیوں بچاروں کو بھلائے بیٹھی ہو۔ اللہ نے پیسے دیے ہیں بازار سے جو جی چاہے خرید لو۔ یہ لوگ تو لوٹتے ہیں۔ لوٹتے ۔۔"

شیما نے گھبرا کر شینو کو دیکھا۔" بھئی واہ اچھی تقریر کر لیتی ہو۔ ارے بہت بانٹ چکی ہوں شینو بیگم کوئی فائدہ نہیں ہوتا لینے والا کبھی جو ذرا جھک کر سلام ہی کر لے۔"

" ہائے۔ یہ تو نہ کہو شیما!" نیلما زور سے بول پڑی۔" بچارے کیسے

احسان مند ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے اس گھڑی خوشی چھلکی پڑتی ہے؛
اسی وقت ملازم کے ساتھ ایک سسکتی بلکتی ہوئی عورت آکر سیشما کے پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "کا کریں۔ بیگم صاحب۔ ہم تو مٹ گئے، ہجور۔ گھر گو گیا۔ مالک۔ بیٹی مر گئی۔ پانی کا آپھت ہمرے اُپر ایسا آیا مالکن۔ ٹھنڈ سے ہمری بیٹی ٹھٹھر کے مر گئی۔ ہیے مان گے، جاڑا لگے ہے اُڑھا دو۔ ہائے ہائے کپڑا بیٹو آکڑ کے رہ گئی ہجور۔ کہاں سے پانی سوتر۔ کہاں سے کوٹ آتا مالک! چٹ پٹ آنکھ پھاڑ کے اینٹھ گئی۔" پاربتی کے کلیجہ میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ تڑپ تڑپ کے رونے لگی" اپنی بچیا کو گودی میں ——— ہمیٹ کے رکھا ہے۔ مگر کیسا پانی تھا اوپر پانی۔ نیچے پانی۔ ای تین دن میں ہم گریب لوگن پر کیسا کیسا دکھ بیت گیا۔ بہت بچّہ مرا ہے، ہجور لوہی میں ہمری چار برس کی مینا بھی چل گئی۔ بینا کپڑا لتا کے، بینا دوا دارو کے ہمر بینا اُڑ گیل بیگم صاحب۔" آنسو کی اس برکھا میں سب کے دل اداس ہو گئے۔ اسٹیل والے نے جلدی جلدی کپڑوں کے گٹھر باندھے اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔
ایک بار پھر اس کی تیز آواز سامنے سڑک پر گونجی۔
اسٹیل والا ہے ....

— —

گینگرین

جس وقت میری جانسن اُس کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ اس کو دیکھتے ہی کانپ گئی۔

"ہلو ـــ" مس ڈیشی!" ـــ میری نے خالص انگلش لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ـــ یہاں تک پہنچنے میں تمھیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ۔؟"

"ـــ اوہ ـــ نو ـــ نو مائی ڈیر ـــ بس سیدھی تمھارے پاس پہنچ گئی اور اب ؟ ـــ کیا خیال ہے تمھارا ؟ ـــ کیوں نہ ہم اپنے کام میں لگ جائیں ۔۔؟

"ـــ ویری سوری مس جانسن ۔! چند لمحوں کے لیے میں یہ بھول گئی تھی کہ تم ـــ تم میرا پوسٹ مارٹم کرنے آئی ہو" مگر ـ اب تو ان ناسوروں نے اندر ہی اندر پھیلتے ہوئے میرے پیر میں گینگرین بنا دیا ہو۔ شاید! ـــ تم کو معلوم ہو کہ میں کتنے ہی انٹرویو لندن، پیرس اور امریکہ میں دے چکی ہوں ـــ مگر ان کی نوعیت دوسری تھی۔ اور اب؟ میرا یہ آخری انٹرویو میری روح کی گہرائیوں اور دل کے سارے جذبوں اور زندگی کے بیتے ہوئے لمحوں کی شکستگی کھول کر رکھ دے گا۔ بس مجھے تھوڑی سی ہمت

پیدا کر لینے دو۔"

"میری تخلیق مشرق اور مغرب نے مِل جُل کر کی ہے۔ برٹش امپائر کے کیپٹیل، لندن کے ایک اونچے گھرانے کی مس ایلین نے ایک انڈین بیرسٹر کو اس زمانے میں کیسے پسند کر لیا تھا، جب یہ ملک زنجیروں میں جکڑا ہوا غلام تھا اور زنجیر کا سرا انگلینڈ کے ہاتھوں میں تھا، میں یہ آج تک سمجھ نہ سکی۔! اور یہ انڈیا۔ ہمارا یہ کنٹری، نہ جانے کتنی تاریخوں، کتنی حکومتوں اور کتنی رنگ برنگی نسلوں کو اپنے دامن میں سمیٹے رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا یہ دیش بہت بڑا اسٹیج رہا ہے، جہاں اَگنت قومیں آ آکر اپنے تماشے دکھا کر چلی گئیں — اور — اور آج میں خود اپنی زندگی کا تماشا تم کو دکھا رہی ہوں۔"

"میرا یہ سرخ و سفید رنگ مجھے ماں سے ملا ہے، میری بڑی بڑی آنکھیں اور مشرقی تراش کا چہرہ باپ کی طرف سے۔ میں اپنے تین بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ میری دادی نے میرا نام "حسن جہاں" رکھا۔ میری جانسن! جانتی ہو؟ اس نام کے معنی ہیں دنیا کی حسین لڑکی۔ اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں سچ مچ نمایاں طور پر حسین تھی۔ میرے بال بہت گھنے اور اتنے لمبے تھے کہ گھٹنوں تک سنہری چادر کی طرح پھیل جاتے تھے۔ ان بالوں میں لچک اور نرمی کے ساتھ ہلکی سی چمک بھی تھی۔"

"میں تمہارا وقت زیادہ نہیں لوں گی۔ معاف کرنا۔ آج جذبات امنڈتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم بھائی بہنوں کی زندگی کچھ اس طرح گزری کہ کبھی مشرقی تہذیب ہم پر چھا جاتی۔ اور کبھی — مغربی، مگر یہ حقیقت ہے کہ مغربی نسل کی ماں کی گود میں پلے ہوئے بچّے کبھی مشرق کے نہیں

بن سکتے ہیں۔ پاپا برسوں انگلینڈ میں رہے مگر ان کی جاگیرداروں والی ذہنیت کبھی نہ بدلی۔ ان کی آواز میں وہی آمرانہ گھن گرج تھی۔ ان کی نگاہوں کی گردش میں وہی تیزی، تندی اور حکمرانی کی چمک ابھی تک موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غلام ملک کا اتنا آزاد خیال بیرسٹر حکومت کی نگاہوں میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔

کالج کی تعلیم کے ساتھ ہی میں گھریلو زندگی کو پسند کرنے لگی تھی۔ کلکتہ جیسے پررونق شہر میں ہائی کلاس کلبوں کی کمی نہ تھی۔ وہاں صرف زندگی رواں دواں ہی نہیں گل بداماں بھی تھی۔ ممی اس چمکتی ہوئی دنیا میں گھنٹوں کھوئی رہتیں۔ مگر ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ وجہ شاید پاپا کا رعب دار چہرہ تھا یا کچھ اور تھا، میں کہہ نہیں سکتی۔ بچپن ہی سے مجھے اپنی دادی سے محبت ملی تھی وہ چھوٹے قد کی خوبصورت، پروقار اور بے حد محبت کرنے والی تھیں۔ اونچے پہاڑوں کے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سلسلے اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور دور تک پھیلے ہوئے ہرے ہرے کھیتوں کے درمیان میری دادی کی جاگیر تھی۔ وہ اس گاؤں اور آس پاس کے کئی گاؤں کی اکیلی مالکن تھیں۔ ان کی حویلی بہت اونچی تھی۔ مجھے اپنی دادی اور اپنے گاؤں سے بہت پیار تھا۔ جب بھی فرصت ہوتی میں اپنی دادی کے پاس آجاتی۔ سر پر بڑا سا ہیٹ اور گاؤن پہنے دیکھ کر ساری بستی اکٹھی ہو جایا کرتی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے ایک تماشا بن جاتی تھی۔ لیکن میری دادی، میری چچیاں اور خاندان کے سارے لوگ جب مجھے لپٹا کر پیار کرتے تو میں ان کی محبت کو دیکھتے ہی یہاں تک پہنچنے کی ساری تکلیفیں بھول جاتی۔ میں اسی طرح دو مختلف تہذیبوں کے درمیان پلتی رہی تھی۔ اپنا پتہ نہیں کس طرح پرسی

مجھ سے قریب ہوتا چلا گیا — میں تو بہت سنجیدہ لڑکی تھی۔ شروع شروع پرسی ممی اور پاپا سے ملنے آتا رہا۔ ممی اس کو گھر کے بچّوں کی طرح سمجھنے لگیں۔ پھر وہ ہمارے کھیلوں میں شریک ہونے لگا۔ وہ لندن سے اپنی سروس پر آیا تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا میرے حُسن کی تعریف ضرور کرتا۔ اس کو میری آنکھوں سے بہت پیار تھا، وہ بار بار یہی کہتا کہ تمھاری ترشی ہوئی خوبصورت آنکھیں مجھے پاگل بنا چکی ہیں۔ لیکن اس کی باتوں سے بھی میرے جذبے کبھی اختیار سے باہر نہیں ہوئے۔ ممی کے لیے پرسی ان کے بچھڑے ہوئے وطن کی یادگار تھا اور شائد اسی لیے ان کی کوشش تھی کہ میری شادی پرسی سے کر دی جائے مگر پاپا کا کھرا سادات گھرانے کا خون اس بات پر ہی کھول اٹھتا تھا اور آخر یہی ہوا کہ جب پرسی کی محبت بہت بڑھ گئی تب پاپا نے ایک آخری شرط رکھ دی کہ اگر پرسی مسلمان ہو جائے تو وہ میری شادی پرسی سے کرنا پسند کریں گے۔ ممی بوکھلائی ہوئی سی حیران رہ گئیں —! "اوہ — ! بیبر...... تم اپنا ٹائم کیوں بھول گیا؟" آخر ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ لیکن مجھ کو یہ بڑا اچھا لگا۔ میری آیا نے مجھ کو ایک شہزادی کی کہانی سُنائی تھی ایسا لگا جیسے پرسی بھی مجھے حاصل کرنے کے لیے اُسی کہانی کے شہزادے کی طرح گاتی چڑیا، بولتا درخت، اور سنہرا پانی لانے کی شرط پوری کر کے مجھے پائے گا۔ اور آخر ایک دن فرائڈے کی نماز سے پہلے پرسی نے ٹوپی پہن کر اپنے مسلمان ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ پاپا بڑے خوش تھے۔ ممی کے لیے یہ بس ایک کھیل تھا۔ اور میں خود کیا تھی، اپنے دلی جذبات کو سمجھ نہ سکی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ایک خوبصورت نوجوان نے مجھے حاصل کرنے کے لیے جو قربانی دی تھی اس نے مجھے صرف خوشی ہی نہیں بخشی بلکہ کسی حد تک مجھ کو مغرور بھی بنا دیا تھا۔ وہ

سچ مچ کا عاشق بن چکا تھا۔ اپنے دفتر سے بھاگا بھاگا سیدھا ہمارے گھر چلا آتا۔ "اوہ! ڈیلیشی۔ میں تم کو نہ دیکھوں تو تھک جاتا ہوں۔ تمھاری آنکھوں کے خمار سے بڑھ کر کوئی نشہ مجھ کو سرور نہیں پہنچا سکتا۔" اور وہ مجھے تکتا ہوا ایسے ہی کرسی پر لیٹا رہتا۔ کم عمری میں اپنے حسن کا احساس یوں تو ہر کسی کو ہوتا ہے لیکن بچپن سے میرے ذہن میں "حسن جہاں" کے نام نے خود میری خوبصورتی کی ایسی گہری اور اتنی دلکش تصویر نقش کر رکھی تھی کہ میں اپنے آپ کو ہمیشہ فضاؤں میں تیرتی ہوئی محسوس کرتی — اور مس جانسن! یقین کرو کہ یہی حسن کی انتہائی برتری کا احساس تھا جس نے مجھے شوقین مزاج نوجوانی سے ہمیشہ الگ تھلگ رکھا تھا۔

پرسی کی محبت میں ایک والہانہ تڑپ تھی اور اس کی یہی بے قراری میرے دل کو امنگوں اور خوشیوں سے بھر دیا کرتی تھی۔ پرسی کی محبت کو دیکھتے ہوئے کبھی میں بہت آہستہ آہستہ اس کے قریب ہو سکی تھی اور جب میں نے اپنے لیے اس کی وارفتگی کو بہت قریب سے دیکھا تب مجھے محسوس ہوا کہ اپنے آپ کو چاہنے سے کسی دوسرے کا اتنی بیتابی سے چاہنا کہیں زیادہ سرور پہنچاتا ہے۔

پرسی سے میری شادی بھی کچھ عجیب مشرقی اور مغربی انداز میں ہوئی تھی، میری شادی کا لباس میری ممی کی خواہش پر بالکل مغربی دلہنوں کا تھا۔ پاپا نے اپنے دوستوں کی موجودگی میں میرا نکاح پڑھوایا، میری گود میں پھولوں کے گلدستے تھے اور ہمارے سروں پر سے چھوہارے لٹائے جارہے تھے۔

پھر ہماری دنیا حسن و محبت خوشبوؤں اور پیار سے بھر گئی۔ میں نے

پرسی کی وارفتگی دیکھی تھی اس کی نگاہوں کی وارفتگی کو پہچانتی تھی اور اب
میں ٹوٹ کر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ جب وہ آفس چلا جاتا تو اس کے
بغیر اتنا وقت گزارنا میرے لیے ایک قیامت سے کم نہ ہوتا۔ چھٹیوں میں
ہم کہیں باہر ضرور چلے جاتے گرمی کے موسم میں پہاڑوں پر اور سردی کی چھٹیاں
بھی کلکتہ سے باہر ہی رہ کر گزارا کرتے تھے۔
پرسی کی محبت کو اس کی منزل مل چکی تھی۔ لیکن میں اس کو پا کر بھی مطمئن
نہیں تھی۔ شاید یہ میری محبت کی ابتدا تھی اور اس کے لیے میری وارفتگی
پیار کا ایک بحر بیکراں بننا چاہ رہی تھی۔ مجھے پرسی کے سکون و مسرت کو دیکھ کر
الجھن سی ہونے لگتی تھی۔ جذبوں کی آنچ پر اس کا سلگتا ہوا ایک ایک لمحہ
مجھے بے حد عزیز تھا۔ مگر اب تو وہ بیوی کی ہر ہر ادا پر مسرور ہونے والا
ایک روایتی شوہر بن کر رہ گیا تھا۔ اور اس کے برعکس میں اس کی خوشبوؤں
کی ہر اک لہر سے، اس کے اتارے ہوئے کپڑوں سے، اس کے تولیہ، جوتے
اور اس سے تعلق رکھنے والی ساری چیزوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگی تھی۔
جب وہ گھر پر نہیں ہوتا تو میں اس کے چھوٹے چھوٹے کام بھی اپنے ہاتھوں
سے اس طرح کرتی رہتی، جیسے یہی میری زندگی کے اولین مقصد ہوں۔ پتہ
نہیں ساری دنیا سے کٹ کر میں پرسی کے ایک اکیلے وجود میں کیسے سمٹ کر
رہ گئی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مرد اپنی تمناؤں کو حاصل کر کے پرسکون
ہو جاتا ہے۔ اور ایک عورت جب کسی سے بھرپور محبت کرتی ہے تو اس کی
محبت سمندر کی بیقرار موجوں کی طرح ساحل سے لگ کر بھی آسودہ نہیں ہوتی۔
اس کی تڑپ کے ہزاروں جلوے ہوتے ہیں، کبھی آفتابی کرنوں میں چمکتی
ہوئی لہریں کسی کے قدموں کو چومتی ہیں اور کبھی چاندنی راتوں میں مچل مچل کر

بکھرتی رہتی ہے۔ میری وارفتہ محبت اپنی سپردگی کے باوجود تشنہ تشنہ سی محسوس ہوتی تھی۔

پرسی نے مجھ کو پھولوں کی طرح رکھا۔ وہ میری ایک ایک خوشی پر اپنی زندگی کی ساری مسرتوں کو قربان کر دینے کو بےچین ہو جاتا تھا۔ ہندستان کی ہر خوبصورت جگہ پر ہم اپنی چھٹیاں گذار چکے تھے اور بیتنے والے سارے پیارے دنوں کو ہم نے اپنے البم اور ڈائری میں محفوظ کر لیا تھا۔ وقت کے گذرتے ہوئے ہر لمحے کو وہ سمیٹ سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے یادگار بنا رہا تھا۔ اسی طرح حسین و رنگین گھڑیاں بیتتی چلی گئیں۔ دو سال پلک جھپکتے بیت چکے تھے۔ اس دفعہ گرمی کی چھٹیوں میں ہم دارجلنگ گئے۔ ہفتہ دس دنوں کے بعد پرسی کچھ الجھا الجھا سا نظر آنے لگا، جیسے وہ مجھے کچھ بتاتے ہوئے جھجک رہا ہو۔ آخر اس نے بتایا کہ اپنے آفس کے کسی ضروری کام سے اس کو کلکتہ جانا ہے۔ ہفتہ بھر میں وہ واپس آ جائے گا۔ لیکن میں اس پہاڑ پر اکیلی رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب اس کے بلانے کا ٹیلی گرام آ گیا تو میں گھبرا کر خود بھی واپسی کے لیے تیار ہونے لگی۔ مگر پرسی کلکتہ کی شدید گرمی میں مجھ کو لے جانے پر راضی نہیں ہو رہا تھا اور آخر اس نے مجھے پہاڑ پر رہ جانے پر رضامند کر ہی لیا۔ بس چند دنوں کی بات تھی۔

پرسی کے چلے جانے کے بعد ہوٹل کے اکیلے کمرے میں رہنا میرے لیے آسان نہ تھا۔ دو تین دن..... تو میں نے کسی طرح گذارے مگر —— یہ بھیانک تنہائی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی میں اپنے گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ سارے راستے یہی سوچتی رہی تھی کہ پرسی اچانک مجھ کو اپنے لیے اتنا پریشان دیکھ کر —— کتنا خوش ہو جائے گا۔؟ میں کلکتہ گئی مگر اس وقت تک اپنے

گھڑی گنی جب تک کہ پرسی اپنے آفس سے گھر نہ پہنچ جائے۔ شام ہو چکی تھی۔ دھند لکا بڑھتا چلا جا رہا تھا، سڑکوں پر لائٹیں روشن ہو چکی تھیں، میں نے اپنی سواری دور ہی چھوڑ دی اور آہستہ سے اپنا گیٹ کھول کر دبے پاؤں اپنے گھر کے اندر جانے لگی۔ میرے بیڈروم میں روشنی ہو رہی تھی۔ پرسی یقیناً آگیا تھا۔ یہ میرا اپنا گھر تھا ـــ میرا کمرہ..... میرا منتظر تھا، خوشی سے میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ میں نے چاہا کہ دروازہ کے پردے سے ٹکراتی ہوئی میں اچانک پرسی کی باہوں میں گر جاؤں، جیسے ہی میں بیقراری سے اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی پرسی اپنی گود میں سمٹی ہوئی ایک لڑکی پر جھکا اس کو چوم رہا تھا۔! اس نے ایک دم سے پلٹ کر مجھ کو دیکھا، لڑکی گود سے پھسل کر بستر پر گر پڑی۔ اور میں لٹی لٹی سی بوجھل قدموں سے باہر نکل آئی ـــ میری جانسن! تم سمجھ سکتی ہو کہ اس واقعہ نے میری زندگی پر کیسی قیامت توڑی ہوگی۔؟

میں اپنے باپ کے گھر لوٹ آئی۔ ٹوٹی پھوٹی ـــ بکھری بکھری سی۔! پرسی نے مجھے واپس بلانے کے لیے کیا کیا کوششیں نہیں کیں۔ لیکن میں اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ دنیا بھر سے کٹ کر رہ گئی۔ ممی اور پاپا میرے لیے بہت پریشان تھے۔ لیکن میں اپنے طور پر فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی پر بوجھ نہ ہوں گی اور خود اپنی ہستی کو برباد ہونے سے بچاتی رہوں گی۔!

کچھ ہی عرصے کے بعد ـــ راستہ چلتے ہوئے میں نے ایک آدمی کو بین بجا کر کوبرا سانپ نچاتے ہوئے دیکھا ـــ زہریلا سانپ! جس کے ڈسنے سے ـــــــ منٹوں میں آدمی مر جاتا ہے۔ مگر یہاں یہی خطرناک سانپ اپنا پھن اٹھائے جھوم رہا ہے، مست و بیخود

ہو رہا ہے۔ میرے سوگوار ہونٹوں پر اچانک ہنسی آگئی۔ اور پرسی کا لڑکی کو جھک کر چومتا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں جھلکا اور میں نے سوچا۔ کسی مرد کی جگہ اگر کوبرا سانپوں سے محبت کی جائے تو ان کی چاہت کہیں زیادہ پائیدار اور اپنی ہو سکتی ہے۔!

اور میں ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح فضاؤں میں بھٹکتی ہوئی ایک ایسے انجانے موڑ پر پہنچ گئی جہاں میری زندگی میں سرسراتے اور رینگتے ہوئے کوبرے اور دوسرے بڑے بڑے سانپ داخل ہو چکے تھے۔ نفسیاتی طور پر شاید اس کو انتقامی جذبے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جب میرے قلب و نظر میں ایک حسین زندگی بن کر پرسی آ چکا تھا ــ تو پھر یہ ڈسنے والا ــ اپنی گول گول آنکھوں سے گھورنے اور اپنی لال لال دو شاخہ زبان لپ لپ کرتے ہوئے باہر نکالنے والا زہریلا سانپ میری محبت کی بین پر اپنا پیار کیوں نہیں لٹا سکتا تھا ــ؟

ــ جانسن ڈیر! تم جانتی ہو کہ میں نے برسوں برس چمکتے ہوئے سیاہ اور خوبصورت چمڑی والے بڑے بڑے سانپوں کو اپنے جسم سے لپٹا کر ڈانس کیا ہے۔ جب میں رقص کے لیے لوگوں کے سامنے جانے لگتی تھی تو دو بڑے بڑے سانپ میرے جسم سے لپٹے ہوئے اپنے پھن میرے چہرہ کے ساتھ دائیں بائیں بڑے پیار سے لگا دیا کرتے تھے۔ ان سانپوں کو دیکھ کر کبھی کبھی کچھ لوگوں کی چیخیں بھی بے اختیار نکل جایا کرتی تھیں ــ میں رقص کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر یہ بھول جاتی تھی کہ مجھ سے لپٹے ہوئے زہریلے سانپ بھی اپنے رقص کا کمال دکھلا رہے ہیں۔ پھر جب یہ موت کا ڈانس ختم ہو جاتا تھا تو میرے تھکے تھکے جسم پر سے وہ سرسراتے ہوئے اتر کر اپنی

ٹوکری میں چلے جایا کرتے تھے ــ ! ہاں میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ پرسی سے کٹ کر خود میں بھی ایک زہریلی ناگن بن چکی تھی - ! اب تک میں یہ نہیں جان سکی ہوں کہ آخر ــ اتنے بھیانک سانپوں سے کھیلنے کا جذبہ میرے دل میں کیسے ابھرا ؟ ــ کیا میری پرسی سے وارفتگی کی محبت کا یہ ردّ عمل تھا - ؟ آج تک مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملا -

پرسی جلد ہی انگلینڈ لوٹ گیا تھا ــ وہ اگر ہوتا بھی تو میرے لیے کیا فرق پڑتا ؟ ــ

میں نے ایک ڈانسنگ اسکول کھولنا چاہا تھا مگر سانپ دیکھتے ہی سارے لڑکے لڑکیاں میرے فلیٹ سے بھاگ جاتے - میری دنیا میں ان سرسراتے اور رینگتے ہوئے سانپوں کے سوا اور کوئی نہ تھا - !

ہندوستان کے اندر اسنیک ڈانس میں میری شہرت ہو چکی تھی ، پھر مجھے ممالک غیر سے دعوت نامے آنے لگے - میری جانس ! تمھیں معلوم ہے کہ میں دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں اپنا یہ حیرت ناک رقص دکھا چکی ہوں -

میرے لمبے لمبے سنہرے بالوں ، لچکتے ہوئے جسم اور میری حسین صورت کے ساتھ جب وہ لوگ لہراتے اور پھن اٹھائے سانپوں کا رقص دیکھتے تو حیرت زدہ رہ جاتے تھے - !

پہلے پہل جب میری ممی نے میرا یہ وحشی اور خطرناک ڈانس ایک کلب میں بیٹھ کر دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی - ! ایک ناقدرے حریص مرد کے ہاتھوں ان کی حسین بیٹی خود ان کی آنکھوں کے سامنے ایک زہریلا ڈانس کر رہی ہے - !

میں افریقہ کے بھی کچھ حصوں میں بلائی گئی تھی۔ زمبیا کے چیف پیراماؤنٹ کے محل میں میرا رقص تھا۔ رات کا وقت تھا میرے کہنے پر وہاں بہت ہلکی روشنی رکھی گئی تھی۔ لوگوں کے بیچ میں پیراماؤنٹ بیٹھا تھا۔ میرے ہلکے پھلکے بدن پر سیاہ لباس اتنا چست تھا کہ جیسے وہ میرا جسم ہی بن گیا تھا۔ میں احاطے کے سبزے پر آہستہ آہستہ دور سے بل کھاتی، مچلتی، تڑپتی اور لہراتی ہوئی آرہی تھی۔ قریب آتے آتے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور انگلیوں کو ملا کر سانپ کے پھن جیسا لہرایا اور اپنے سارے جسم کو سانپ کی طرح بل پر بل دے کر سمٹتی، مچلتی، لہرا لہرا کر پیراماؤنٹ کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ چیف اپنے قریب مجھے آتے ہوئے دیکھ کر چیخیں مارتا ہوا نکل بھاگا۔ پھر تو ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی۔ اس دن میرے دونوں سانپ تھکے ہوئے بیمار سے ہو رہے تھے، اس لیے میں خود ہی سانپ بن کر ڈانس کر رہی تھی۔

جانسن ڈیر۔! میرے ان زخمی پیروں میں کتنی پھرتی، کتنی لچک اور کتنا کونٹ بھرا ہوا تھا۔ میں تم کو کیا بتاؤں۔ ! میرے یہ پیر بڑے خوبصورت۔ کھلے ہوئے گلاب کی سی رنگت والے تھے۔! انہی لچکتے ہوئے نرم و نازک پیروں نے مجھ کو دنیا کے بڑے بڑے لوگوں سے ملایا تھا۔ لندن میں جب ملکہ نے میرا اسنیک ڈانس دیکھا تو میری شہرت کی دھوم مچ گئی۔ وہاں کئی کلبوں میں میرا پروگرام ہوا۔ ایک کلب میں اچانک میرا سامنا پرسی سے ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت اور غم سے میرے جسم سے لپٹے ہوئے خطرناک سانپوں کو دیکھتا رہا تھا۔ اک اچٹتی ہوئی اجنبی سی نظر میں نے اس پر ڈالی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ دم بھر کے لیے مجھ کو خوشی ہوئی مگر اس کی جگہ یہ زہریلے سانپ میرے اپنے تو ہیں ـــ آج بائی ڈیر

...... میں اپنی شکستگی کا تمہارے سامنے اعتراف کر لینا ضروری سمجھتی ہوں ۔ شاید اب ــ میں کچھ لمحوں کی مہمان ہوں ۔ میں ایک ایسی غمزدہ عورت ہوں جس کا اپنا کوئی نہیں ۔ میرے غیر معمولی حسن نے میرے اندر اتنا غرور بھر دیا تھا کہ میں پرنسی کی ایک خطا بھی معاف نہ کر سکی تھی ۔ وہ برسوں میرے لیے تڑپتا رہا ـــــ اور اب تک وہ میری شادی اور برتھ ڈے پر اپنی نیک خواہشات کے محبت بھرے کارڈ بھیجتا رہتا ہے ۔ لیکن میں ہمیشہ بے پرواہ رہی ۔ اگرچہ زہریلے سانپوں نے مجھے اپنی محبت ہی نہیں شہرت بھی بخشی تھی ۔ پھر بھی ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کی کچھ تمنائیں ہوتی ہیں، وہ کچھ خواب بنتی ہے ۔ زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اپنا اک گھر ہوتا ہے، دن بھر کا انتظار محبت کے پیمانوں میں مسرتوں کا سرور بھر دیتا ہے، ننھے ننھے بچوں کے معصوم قہقہوں کا سنگیت زندگی کی دلکشی کو حسین تر بنا دیتا ہے ۔ ۔ لیکن میں تہی دست رہی ۔ اپنی زندگی کو انا کی سولی پر چڑھا کر اب میں سوچتی ہوں کہ مجھے کیا مل گیا ۔ ؟؟ میں نے اپنے آپ سے اپنی بیتابانہ محبت کا بدلہ ضرور لیا ۔ اور ــ اور ۔ اس طرح میں نے اپنے تلوؤں کو زخمی کر لیا ۔ اپنے جسم کے ذرّے ذرّے کو بکھیر دیا ۔ اور میرے پیروں کے زخم زہریلے ہو کر گینگرین بن چکے ہیں ۔ بس یہ چند اکھڑی ہوئی سانسیں باقی رہ گئی ہیں ۔ میں نے ایک ناکامیاب زندگی گزاری ہے ۔ جس میں چند آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ۔"

میری جانسن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ۔ اس نے بڑی غمزدہ نگاہوں سے بیڈ پر پڑی ہوئی نڈھال سی کمزور تھکی بیمار عورت کو دیکھا جو خرخر کرتی ایک گلدار سی خوبصورت بلی کو اپنے ڈھکے ہوئے سینے سے لگا رہی تھی ۔ !

ــ" اور تم بھی سن لو ۔ میری جانسن ! کہ یہ گھر میری بہن کا ہے جہاں میں اس کی مرضی کے خلاف اپنا آخری وقت گزار رہی ہوں ۔ اس کے بچے کبھی کبھی میرے پاس آ کر بڑے رحم بھرے لہجے میں کہتے ہیں " مائی پور ـ

آنٹی! ان کی یہ آتنی چھوٹی سی بات میرے دل کو چھید ڈالتی ہے ۔ اور ایک فلم کی طرح میری زندگی کی ناکامیاں میری نگاہوں میں جھلک اٹھتی ہیں۔ چراغِ حیات کی لَو بھڑک رہی ہے ۔۔ میں تاریکیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جانے کو تیار ہو چکی ہوں ۔ مگر میری پیاری بلّی ۔۔۔ پھر اس کا کیا ہو گا؟ ۔۔ ڈرائنگ روم کے گُشتوں سے کھیلتے کھیلتے اس کو نوچ بھی دیتی ہے ۔ اسے سزائیں ملتی رہی ہیں۔ لیکن میں نوکروں کے ذریعہ اس کو آسام پہنچانے کے سامان بھی کرتی رہی ہوں ۔ اور ۔۔! میری جانسن! ۔ میرے بعد اس کا کیا ہو گا۔ ؟ "مائی سویٹ ڈیریسٹ"

مس جانسن اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھی ۔ اس نے جھک کر بلّی کی پُشت پر بڑی نرمی اور پیار سے ہاتھ پھیرا ۔ ڈیلے کمزور سفید ہاتھ کو اپنے گرم ہاتھوں میں لے کر تھوڑا دبایا۔ "تھینک یو مس ڈیلیشی! بائی"

ڈیلیشی کی دھندلی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند بے بس قطرے بے اختیار ٹپک پڑے ۔۔ "اچھا مس جونسن ۔ خدا حافظ ۔ ! بائے!

━ ━

آخری سلام

تو رادھا رانی — تم جواب تک پھولوں کی سیج پر سوتی رہی تھیں، آخر جیون کا سب سے بھیانک روپ بھی دیکھ ہی لیا نا؟ ایرکنڈیشن روم میں پہروں بیٹھی خیالی محبوب کی تصویریں بنا بنا کر تم بگاڑتی اور سجاتی رہی تھیں وہ تمہارا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔ اور تم خواہ مخواہ سپنوں کے ہفت خانوں میں دور تک اترتی چلی گئی تھیں۔

—— تمہاری نگاہوں کے سائے گہرے ہوتے گئے اور تمہاری کوریاؤں میں ارمانوں کے لہو زیادہ سے زیادہ رنگین ہو کر چھلکنے لگے تھے۔ تمہاری بنائی تصویروں میں زندگی سی بھر گئی تھی اور ان کے اندر نگاہوں کی تشنگی، ابھرے کی افسردگی اور لبوں کی پیاس بھری خموشی اور فضاؤں پر چھائی ہوئی دھند اور انہی ساری چیزوں کو دیکھ دیکھ کر کچھ دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ تمہارے خیالوں اور کامناؤں کا دھارا یکدم سے کیسے بدل گیا ہے؟ اور ہنستی کھیلتی ہوئی رادھا کی سوچوں میں یہ گھمبیرتا کہاں سے بھر گئی ہے؟

—— رادھا رانی! ایک دن میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا: "کچھ دیئے جلا لو، کہ زندگی کے ہر موڑ پر اندھیروں میں ٹھوکریں لگتی ہیں۔" مگر تم نے میری بات نہ مانی اور آخر وہی ہوا جس سے میں ڈرتی تھی —! سپنے کبھی پورے ہوئے ہیں؟ ممکن ہے کہ کسی کے خواب کی تعبیر مل گئی ہو لیکن میں نہیں جانتی۔

تم تو بڑی اشپکچول سمجھی جاتی تھیں۔ کالج کے اندر اور اپنے گھر میں تمہاری باتوں

کی سراہنا ہوا کرتی تھی۔ ڈبیٹ میں جس طرح کھلے دل کے ساتھ تم اپنے خیالات اور آدرشوں کو پیش کرتی رہی تھیں، وہ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی ۔۔۔! پھر بھی تم اپنے آپ سے مطمئن نہ تھیں اور یہی کہا کرتی تھیں کہ مجھیں اپنے سے ڈر لگتا ہے۔ "بزدل لڑکی!" میں نے ہمیشہ تمہاری ہنسی اڑائی تھی۔ بھلا کوئی اپنے آپ سے بھی ڈرتا ہے؟ اور رادھا رانی! سچ مچ اپنے سے ڈر گئیں، تم اپنے آپ سے مات کھا گئیں جس دن تمہارے پپا نے تمھیں اپنے پاس بلا کر بڑے پیار سے کہا تھا "رادھا رانی! کچھ لوگ ملنے آئیں گے، تم ذرا ان سے اچھی طرح ملنا"۔ تم کچھ سمجھی تھیں، کچھ نہیں ۔۔۔! لیکن جب تم اپنی ماں کے ساتھ مہمانوں سے ملنے آئیں تب اچانک تم نے محسوس کیا تھا کہ اس وقت تمہاری حیثیت منڈی میں رکھی کسی سبزی، پھل یا جنس کی سی ہے اور خریدنے والے تمھیں گہری نگاہوں سے پرکھ رہے ہیں۔ تم جو نہ جنس تھیں نہ سبزی اور نہ پھل، ان تولنے والی نگاہوں کی تاب نہ لا سکیں اور اچانک تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور تمہاری گہری سیاہ آنکھوں میں نفرت بھری جھلاہٹ سی بھر گئی۔ تو رادھا رانی! تم اب تک لڑکیوں کی زندگی کے اتنے اہم موڑ سے انجان ہی بنی بیٹھی تھیں؟ کیا تمھیں معلوم نہیں تھا کہ تم جیسی لڑکیوں کی پیدائش کی خبر سُن کر کبھی فخر و مسرت سے بندوق نہیں داغی جاتی ہے۔ دنیا میں تمہارے آجانے پر تمہاری ماں کا کمزور چہرہ مرجھا کر اور بھی جھک جاتا ہے، اسی اک خیال سے کہ نجانے مارکیٹ کا بھاؤ تمہارے بیاہ کے وقت تک کیسا رہے گا؟ اور تم کس منڈی میں پسند کی جا سکو گی؟ ۔۔۔ تو رادھا رانی! اس منڈی کا بھی ایک عجیب دستور ہے کہ بکو بھی تم ہی اور اپنی قیمت بھی تم کو ہی چکانی پڑے۔ کتنے گھاٹے کا سودا ہوتی ہیں یہ لڑکیاں بھی! مگر ۔۔۔ تمہارے اندر تو اتنی برداشت نہ تھی کہ خود ہی اپنی قسمت لیے اپنی تمناؤں کے دیپ جلائے اور رو جا

کے پھولوں سے تھال سجائے کسی انجان قدموں پر آرتی اتارنے کو تیار ہو جاتیں۔

——— تو رادھا رانی! زندگی کی اس دہلیز پر تمھارا یہ پہلا قدم تھا جس کا یہ انجام ہوا، پھر تمھاری سہیلیوں نے تمھیں کبھی شاداب ہونے نہ دیا۔ تم اپنی لائبریری اور اپنے تصورات میں کھوتی چلی گئیں اور جب کچھ دنوں کے بعد میں نے تمھیں دیکھا تو حیران رہ گئی!

——— "ارے یہ تمھیں کیا ہو رہا ہے؟ تم جو چٹکتی ہوئی کلیوں کی بہار تھیں۔ پھر یہ گیندے کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی رنگت کہاں سے لے آئیں"؟

——— تم نے بڑی شگفتگی سے کہا تھا "شاید میں بیمار ہو رہی ہوں۔ مجھ سے تیز چلا نہیں جاتا۔ تھک جاتی ہوں، اور پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے"۔

——— "ہونہہ! تو بے وقوف لڑکی! آخر تو نے اپنے آپ کو ستا ستا کر بیمار ڈال ہی لیا نا؟ اور بنتی رہو چاند کی کرنوں سے اپنے چہرے کا نقاب۔ آخر کیا ملا تمھیں حقیقتوں سے نگاہیں چرا کر ———؟ اور رادھا رانی دیکھتے ہی دیکھتے تم کسی شمع کی طرح پگھلنے لگ گئیں۔ درد کی تکلیف سے تم اچانک اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ تمھارے پیا نے گھبرا کر تمھیں اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔

اُوہ! رادھا رانی! تمھارے ہوسپٹل کا سارا ماحول زندگی ——— کی رنگینیوں اور مسرتوں سے کس قدر دور تھا! اور ہر طرف سے جیسے دنیا کے فانی ہونے کا نظارہ پیش کر رہا تھا غمزدہ، مرجھائی صورتوں والی راہبہ نرسیں اپنے گلے میں لمبی لمبی ڈوریوں والی تسبیح کے ننھے ننھے دانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صلیبیں لٹکائے دنیا کی بے ثباتی کا دلوں پر نقش ڈال رہی تھیں اور پھر ہسپتال کے ہر ہر کمرے میں کانٹوں کا تاج پہنے یسوع مسیح صلیب پر بیہوش لٹکے ہوئے

اپنی سچائی اور معصومیت کا یقین دلا رہے تھے - ڈیٹول اور کلورین کی بو سے
—— ہوسپٹل کا کونہ کونہ بسا ہوا تھا - لیکن رادھا رانی! تمہارے ہوسپٹل
کے در و دیوار پر صلیبوں کے لرزتے ہوئے سایوں نے میرا دم گھونٹ رکھا تھا -
شام کے ہلکے اندھیرے جب ذرا گہرے ہونے لگے تو تمہارے ہوسپٹل کے فلور
کی طرف سے ایک ہی ساتھ اور ایک ہی لے میں تھرتھراتی، کانپتی، نڈھال سی
گڑگڑاتی ہوئی آوازوں میں کچھ شبد سنائی دیے جو نغمے تو ہرگز نہیں تھے - ہاں
شاید وہ کراہیں تھیں - ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی سی کراہیں، جیسے دنیا سے رخصت
ہوتی ہوئی سانسیں دم بھر کے لیے ٹھہر ٹھہر کر ایک ہلکا سا سہارا لے رہی ہوں —اور
رادھا رانی! تم نے حیران ہو کر ڈیوٹی نرس سے پوچھا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو اس نے
بتایا تھا کہ " آسمانی باپ سے جو بیمار ہیں ان کی صحت اور جو مر چکے ہیں ان کے
سکون کے لیے پریئر ہو رہا ہے" —اور ہوسپٹل کی وہ پہلی رات میں نے تمہارے کمرے
میں ڈرتے ڈرتے اور جاگتے ہوئے گزار دی تھی — ! اور تم بہت دنوں بعد
نیند کی گولیاں کھلا کر بڑے آرام سے سلا دی گئی تھیں -

تمہارے ڈاکٹر آتے رہے اور قسم قسم کے آلوں سے تمہاری جانچیں ہونے
لگیں - سخت چہرے والے بڑے سرجن کمار نے دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ ہو سکتا ہے
کہ تمہارا آپریشن کرنا پڑے -

پھر اچانک تمہارے کمرے میں ایک دن اجلی چادر سے ڈھکی ایک ٹرالی
لائی گئی اور اس کے ساتھ ایپرن پہنے گئی کاغذات ہاتھ میں لیے ایک بہت ہی
خوب صورت سا ڈاکٹر تمہارے پاس گیا " آپ کو ایکسرے کے لیے جانا ہے "
اور تم رادھا رانی جو بڑی گمبھیرتا اور رکھ رکھاؤ بھری کویتائیں لکھنے والی تھیں —
دم بھر کے لیے مسحور سی ہو کر رہ گئیں — تمہارے سپنوں کا دیوتا اچانک اس طرح

کہاں سے آگیا تھا؟ ۔ گلے میں اسٹیتھس کوپ ڈالے، تھکا تھکا سا، آنکھوں میں نیند کا خمار لیے جب وہ تمھاری ٹرالی کے ساتھ لفٹ سے نیچے اترنے لگا، تب یک بیک پہلی بار تم نے مسرت کی اک لہر سی محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا کہ پوجا کے پھول انہی قدموں پہ چڑھاتے ہوئے اپنا جیون دان کر دینے میں کتنی خوشی حاصل ہو سکتی ہے!

تب رادھا رانی! ان دنوں تمھارے بیمار چہرے پر آپ ہی آپ ایک دلتی سی آگئی تھی اور کمزور آنکھوں میں کبھی کبھی آشاؤں کے جلتے ہوئے دیپ کی لَوئیں بھی کانپ کانپ سی جاتی تھیں۔

اور ایک دن تم نے مجھے سرگوشیوں میں بتایا تھا کہ اب تم اپنی رگوں میں لہو کی تیز ہوتی ہوئی گردشوں کو محسوس کرنے لگی ہو۔ تمھاری آنکھوں میں پیار بھرا انتظار رہنے لگا ہے۔ اور جب تمھارا ڈاکٹر اپنے اسٹیتھس کوپ سے تمھارے قریب جھک کر تمھارے دل کی آواز سننے لگتا ہے تو اس کی خوشبوؤں سے دل کی دھڑکنیں تمھاری آرزوئیں بن کر اس کے اسٹیتھس کوپ میں تھرتھرانے لگتی ہیں، اور جب وہ اپنی انگلیوں سے تمھاری بیمار کلائی تھامے نبض کی رفتار گننے لگتا ہے تو تمھارے چہرے پر سہاگ رات کی دلہنوں کا سا نکھار آجاتا ہے اور تم لاج ونتی کی طرح اپنے آپ سے شرما کر اپنی باہوں میں سمٹ جانا چاہتی ہو۔

تمھارے چہرے پر شادابی کی پرچھائیوں کو دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے تھے کہ تم اب صحت کی طرف لوٹ رہی ہو۔ تمھیں اس ہوسپٹل سے بڑا پیار ہو گیا تھا ــــ شاید اسی لیے کہ تم نے یہاں اپنی کامناؤں کی منزل پالی تھی۔ اور تصور کا خیالی محبوب حقیقت کے روپ میں تمھاری نگاہوں کے سامنے آگیا تھا ــــ! مگر رادھا رانی تمھاری نگاہوں میں حجاب سا کیوں رہنے لگا تھا؟ ــــ کیا سچ مچ تم اپنے آپ سے ڈرنے لگی تھیں؟ ــــ یا تمھارے سامنے کانٹوں کا تاج پہنے صلیب پر لٹکی

ہوئی لہو لہان مورتی تمہیں حقیقی اور مجازی محبت کا انجام یاد دلا رہی تھی ۔۔؟
تمہاری خاموش اور کمزور نگاہوں کو جیسے گویائی کی طاقت مل گئی تھی ۔۔ اور درد سے کراہتی ہوئی آہ ایک پکار بن گئی تھی ۔۔ ہائے! رادھا رانی! اپنی ساری تمناؤں کو گلے سے لگا کر بھی تم کبھی کبھی تڑپ کر رہ جاتی تھیں ۔۔ تم جو ہمیشہ بلندیوں پر اڑتی رہی تھیں ۔۔۔ چاند ستاروں کے سنگ آنکھ مچولی کھیلتے رہنا تمہیں پسند تھا پھر یہ اچانک ہماری دھرتی تمہیں اتنی پیاری کیسے لگنے لگی تھی؟ اسی لیے نا ۔ کہ پوجا کے پھول اسی زمین پر کھلتے ہیں ۔
جس دن تم کو آپریشن کے لیے جانا تھا تم نے اپنے ڈاکٹر سے بس ایک ہی پرارتھنا کی تھی کہ وہ تمہارے پاس ہی رہے گا ۔ اس نے تمہیں یقین دلایا تھا کہ بڑے ڈاکٹر کا اسسٹنٹ ہونے کی حیثیت سے اس کی تو وہاں رہنے کی ڈیوٹی ہی تھی اور وہ ضرور وہاں رہے گا ۔
جب تمہیں اسٹرلائز کیے ہوئے کپڑے پہنا کر ٹرالی پر لٹایا گیا اور آپریشن روم کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس وقت تمہارے پپا اور ممی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں "بھگوان ۔۔ اے میرے بھگوان! میری بچی کو بچا لے" ۔ اور جب ربر کے بے آواز پہیوں پر چلتی ہوئی ٹرالی اندر جا کر اور اندر کی طرف مڑتی چلی گئی ۔ تب باہر کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی بند ہو گیا اور رادھا رانی! اتنے کڑے وقت میں تم بالکل اکیلی ۔۔۔ ہم سب سے جدا تھیں ۔۔ ! مگر تمہارا ڈاکٹر ہرے رنگ کی اسٹرلائز کی ہوئی گول ٹوپی اور ہرا لباس پہنے ماسک باندھے تمہارے پاس تھا ۔ مگر ہم بھی بڑے نڈھال اور غمزدہ سے بند دروازے کے پاس سبز رنگ کی اونچی کرسیوں پر چپ چاپ مورتی بنے بیٹھے تھے ۔ چند گھنٹوں بعد تم واپس لائی جا رہی تھیں ۔ تمہارے جسم میں چڑھائے جاتے ہوئے گلوکوز کے پانی کی بوتل

کو تھامے ہوئے نرس تمھاری ٹرالی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ تمھاری آنکھیں بند تھیں اور تمھارے چہرے سے ایتھر کی تیز بُو آ رہی تھی۔ تمھارا ڈاکٹر تمھارے بہت سے کاغذ سنبھالے تمھارے ساتھ ساتھ آ رہا تھا ــــ شاید وہ بہت تھک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی غمناکی چھائی تھی جیسے ابھی ابھی وہ اپنے کسی بہت ہی عزیز کو دفن کر کے آ رہا ہو۔ اڑی ہوئی رنگت، سوکھے ہوئے لب اور آنکھوں میں حسرت و افسردگی۔ مگر اچھا ہوا رادھا رانی جو تم اس کے اس رُوپ کو نہ دیکھ سکیں، تم بیہوش تھیں نا ــــ اور پیٹ کا اتنا بڑا آپریشن کوئی کھیل تو نہ تھا۔!

دھیرے دھیرے تم اچھی ہونے لگیں۔ سبھی خوش تھے مگر تمھارے پپا کی آنکھوں میں اضطراب سا بھر گیا تھا وہ جب بھی تمھارے قریب جاتے تو بڑے پیار اور رحم کے ساتھ تمھارے سر کو اپنے پہلو سے لگا کر تھپکنے لگتے تھے۔ اور تمھارا ڈاکٹر جو تمھارے ہوش میں آنے کے بعد کئی دنوں تک غائب رہا تھا، اور جب آیا بھی تھا تو اس میں تمھاری طرف دیکھنے کی ہمت نہیں تھی، جانے کیوں وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا ــــ اور رادھا رانی! ــــ تم نے ایک دن اس سے کہا تھا کہ "مجھے تمھارے اس ہوسپٹل سے محبت ہو گئی ہے ــــ یہاں زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے اور زندگی کے پا لینے کا احساس ہوتا ہے ــــ! مگر تمھاری باتوں کو سُن کر وہ بڑے کرب سے بولا تھا "یہاں کے در و دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر کتنی ہی زندگیاں ٹوٹتی بھی تو رہی ہیں" ــــ!

تم ہوسپٹل سے اپنے گھر جانا نہیں چاہتی تھیں ــــ مگر تمھارے سرجن کمار نے تمھیں جھوٹی تسلیاں دے کر گھر بھیج دیا تھا ــــ تم بے چین بے چین سی تھیں جیسے تمھارا سکون چھن گیا ہو۔ لیکن رادھا رانی! تم تو شروع ہی سے اپنے آنسوؤں کو پی لینے میں ماہر تھیں۔ پھر تمھارا درد کون جا سکتا تھا ــــ ہاں کبھی کبھی جب تم بے چین ہو جاتیں تو ہوسپٹل کا نمبر لگا کر کہتیں: "ہلو ــــ ہلو انکوائری! کیا آپ

سرجن کمار جی کے اسسٹنٹ کو فون پر بلا سکتے ہیں؟ — اور رادھا رانی —!
کبھی تو وہ ایمرجنسی میں رہتا، کبھی آپریشن روم میں — اور کبھی تم اس کی مہربان آواز بھی سُن لیا کرتی تھیں — صرف ایک جانی پہچانی آواز جو تمھارے لیے اس کی صورت بھی بن جاتی تھی — پیار کا لمس بھی اور نگاہوں کی تسکین بھی —!
بیچارہ مجبور انسان کیسے کیسے کھلونوں سے بہل جاتا ہے۔

پھر چند مہینوں کے بعد تم اسی ہوسپٹل میں لائی گئی تھیں — بے حد کمزور اور پیٹ کے درد سے تڑپتی ہوئی — تم نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو مشکلوں سے اٹھا کر اپنے ڈاکٹر کو پرنام کیا تھا — تمھیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کی رونق مٹ گئی تھی — وہ تو بہت پہلے ہی سے جانتا تھا کہ تمھارا مرض، تمھیں کبھی جینے نہ دے گا — جس دن تمھارا آپریشن ہوا تھا اور پیٹ کھلتے ہی چپکے سے سلائی کر دی گئی تھی کہ کینسر کا مرض چھڑ جانے سے اور بھی تیزی سے بڑھنے لگتا ہے اور تمھارا کینسر تو اسی وقت بڑھ چکا تھا — مگر تم کو دوبارہ ہوسپٹل میں آنے کی خوشی تھی — تم نے اپنے ڈاکٹر سے رُکے رُکے لہجے میں کہا تھا کہ زندگی مجھے پکار رہی ہے اسی لیے تو یہاں آ گئی ہوں — مگر وہ پکار کس کی تھی رادھا رانی؟

یہ تمھارا ڈاکٹر اچھی طرح سے جان رہا تھا — پھر آہستہ آہستہ چراغ کی لو مدھم سے مدھم ہوتی چلی گئی — اور تمھارا درد اتنا بڑھ گیا تھا کہ انجکشن دے دے کر تمھیں سُلائے رکھا جاتا تھا — حالانکہ تم یہی چاہتی تھیں کہ تمھاری آنکھیں کھلی رہیں تاکہ تم اپنی آنکھوں کے ذریعہ حیاتِ تازہ کی لہروں کو اپنے اندر سمیٹتی چلی جاؤ — ہم سبھی تمھاری حالت کو دیکھ کر تمھاری ابدی جدائی کے غم کو سہہ لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے — اور رادھا رانی! جب درد سے تڑپ کر تم ہوش میں آ جاتی تھیں تو تمھارے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لینے پر بھی تمھارا ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا تھا — اور ہم بھی بے بس

بیٹے تمھیں تسکین بھی نہیں دے سکتے تھے۔ بس تمھارا اب ایک ہی علاج باقی رہ گیا تھا کہ تمھیں انجکشن دے دے کر سلائے رکھا جائے، تمھاری آدھی کھلی اور آدھی چھپی ہوئی آنکھیں بیحد کمزور ہو گئی تھیں اور ہم کتنے سخت جان تھے راد ھارانی! جو اس حال میں تمھیں دیکھ رہے تھے۔ تمھاری آنکھیں جب کھلتیں ان میں ایک تلاش ہوتی تھی۔ بڑی بے صبری کی تلاش!۔ مگر جس کو تمھاری نگاہیں ڈھونڈتی رہتی تھیں اس کو اور بھی تو کام تھے۔

پھر نہ جانے کیسے اچانک سارا شہر پانی میں ڈوب گیا تھا، کوئی بند یک بیک ٹوٹ گیا تھا، اور یک دم سے دیکھتے دیکھتے سیلاب کا پانی سارے شہر میں بھر گیا، ہوسپٹل کا اندر اور باہر پانی سے جل تھل ہو رہا تھا، سڑکوں پر کشتیاں چلنے لگی تھیں، ہوسپٹل کی نچلی منزل میں پانی بھر رہا تھا، بجلی اور پینے کے پانی کی لائن کٹ چکی تھی۔ لمبی لمبی سفید پوشاکیں پہنے ہوئے راہبہ اسٹافیں ہوسپٹل کے مریضوں کو ان کے گھر بھجوانے میں لگی ہوئی تھیں، ان کو ریلیف کے لیے کھانا اور ابالا ہوا پانی لے کر، بہت سی دواؤں کے ساتھ ریلیف کیمپوں میں جانا تھا۔

ہوسپٹل کے احاطے میں چھوٹی بڑی کئی کشتیاں پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھیں۔ تمھارے پپا بھی کہیں سے ایک کشتی لے آئے تھے جس گھڑی تم اسٹریچر پر لٹائی گئی تھیں، تمھاری آنکھیں بند تھیں۔ تمھارے ڈاکٹر نے بھی تمھارا اسٹریچر پکڑا تھا اور زینوں سے اترتے ہوئے ننگے پاؤں پانی کی لہروں میں ڈگمگاتی ہوئی کشتی پر تمھارے اسٹریچر کو رکھ دیا تھا، تمھاری اس کشتی پر ہم سبھی لوگ تھے، صرف تمھارا ڈاکٹر سفید ایپرن پہنے باہر کی طرف ڈوبی ہوئی سیڑھیوں کے پاس، پانی میں کھڑا بڑی حسرتوں سے تمھیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کشتی ذرا زور سے ڈگمگائی اور ہچکولے کھاتی ہوئی جب وہ ہوسپٹل کی سیڑھیوں سے کھسکنے لگی تو

تمھارے ڈاکٹر نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر بڑے احترام کے ساتھ درد میں ڈوبا ہوا تمھیں آخری سلام کیا تھا — مگر تم تو رادھا رانی! ساری باتوں سے بے خبر سوتی رہی تھیں — لیکن میری آنکھوں سے اس وقت بے اختیار آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے تھے۔

کشتی چلتی رہی، گنگا کا پانی اپنے کناروں سے چھلک رہا تھا اور ساون کا بپھرا ہوا سیلاب سارے شہر کو ڈبوئے چلا جا رہا تھا۔

اور رادھا رانی — ! جب پانی سے بھرے ہوئے گھر میں تمھیں اسٹریچر سے اتارا جانے لگا تو وہاں صرف تمھارا ٹھنڈا جسم تھا — اور تمھاری آتما، بادلوں کے سنگ اڑتی ہوئی آکاش پر جا چکی تھی یا پھر ہوسٹل کے گرد منڈلاتی رہ گئی تھی — کون جانے؟

▬ ▬

چند عمدہ افسانوی مجموعے

ایک حلفیہ بیان	اقبال مجید	۲۰ روپے
فصیل	تسکین زیدی	۲۵ روپے
بجھا ہوا البم	اقبال متین	۲۰ روپے
خالی بٹاریوں کا مداری	اقبال متین	۲۰ روپے
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۱۲ روپے
بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۲۰ روپے
پیتل کا گھنٹہ	قاضی عبدالستار	۱۵ روپے
گونگی توپ	قطب اللہ	۱۵ روپے
ویزا	قطب اللہ	۲۰ روپے
کرشن چندر کے افسانے	مرتبہ اطہر پرویز	۳۵ روپے
پل صراط	موسیٰ مجروح	۲۵ روپے
سبزۂ بیگانہ	نور پیکار	۲۰ روپے
دوسرا بھوروخاں	نور پیکار	۱۸ روپے
وہ سب باتیں	تبلیشر پردیپ	۲۰ روپے

ڈرامے

اسٹیج ڈرامے	آفاق احمد	۳۹ روپے
ٹی وی ڈرامے	آفاق احمد	۴۰ روپے

نصرت پبلشرز - حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ

۲۲۶۰۱۸

... ہندوستان پرنٹنگ پریس فون نمبر ۲۹۵۲۸ گولہ گنج لکھنؤ میں چھپا